مسکان احزم

شامِ الم

"اور یہ دیوانہ شخص اس کہانی کا رومیو ہے جس کی جولیٹ چودہ برس پہلے اس سے بچھڑ گئی تھی۔" وہ مسکرایا تو آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گر پڑا۔

☆☆☆

"اللہ بخشے تمہاری ماں کو، کیا لذیذ پروٹھے بنایا کرتی تھی۔ آہا! سواد ہی آجایا کرتا تھا، لیکن اب وہ سواد کہاں۔" چودھری ہدایت رسول تیسرا پراٹھا ختم کر دینے کے قریب تھے مگر مزا انہیں ابھی تک نہیں آیا تھا۔

گھر کی باورچن ایک اور پراٹھا گرم گرم اتار لائی تھی اور اب ان کے تھال میں رکھ رہی تھی جبکہ وہ بریڈ کو آملیٹ کے ساتھ کھاتے ہوئے جلدی میں نظر آرہی تھی۔

"ابا جی! کبھی تو سکینہ کو شاباشی دے دیا کریں۔

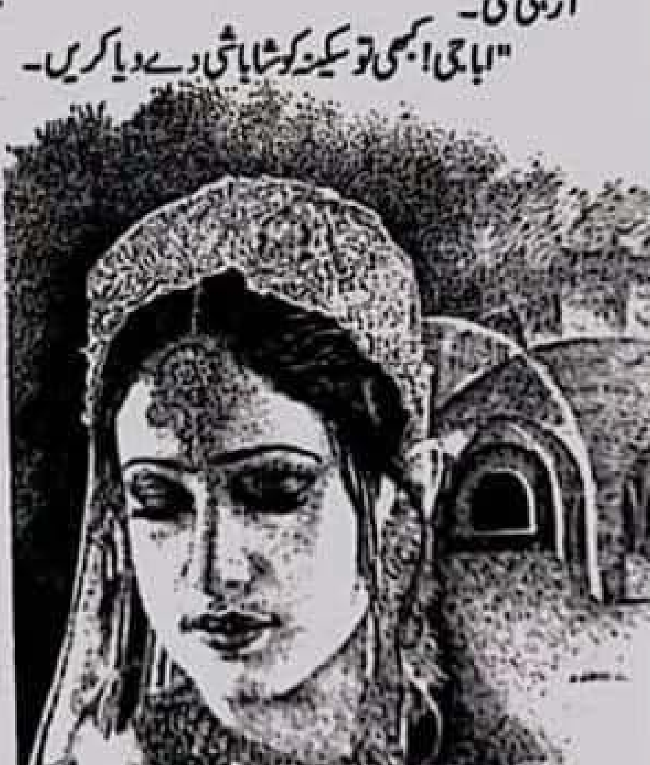

بے چاری اتنی محنت سے ناشتا بناتی ہے آپ کے لیے۔" سکینہ کے چہرے پر پھیلی بے چارگی وہ محسوس کر چکی تھی اسی لیے اب اس کی حمایت میں بول رہی تھی۔

" آئے ہائے صدقے پتر! اگر وہ اتنا ہی مزے کا کھانا بناتی ہے تو پھر تُو کیوں نہار منہ یہ سوکھے ٹکڑے کھا رہی ہے؟" ڈکار لینے سے پہلے وہ تنگ کر بولے تھے۔

"اوہو ابا جی! آپ بھی نا، یہ براؤن بریڈ ہے اور میں یہ اس لیے کھاتی ہوں کیونکہ میں ڈائٹ کرتی ہوں۔" اس نے سلائس کا آخری لقمہ منہ میں رکھا اور ساتھ پڑا پانی کا گلاس اٹھا کر غٹا غٹ پی گئی۔ صبح کا وقت تھا اور وہ ہاسٹل واپس جانے کی تیاری کیے بیٹھی تھی۔ سردی اپنے عروج پر تھی اس لیے اس نے خود کو گرم رکھنے کے لیے چادر اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔

"او چھڈ پراں ایس انگریجی نوں۔ تُو مجھے سیدھے لفظوں میں بتا۔" چودھری ہدایت رسول اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

"تسی وی چھڈ دو ابا جی! یہ باتیں آپ کے سمجھ میں نہیں آنے والی۔" وہ مسکرا کر اٹھ گئی۔

"باجی! کیا آپ واقعی جاج (جہاز) اڑائیں گی؟" سکینہ آنکھوں میں بے یقینی لیے اس کے ہاتھ دھلا رہی تھی۔

"ہاں، تمہیں یقین نہیں ہے کیا؟" وہ ہاتھوں کو مل مل کر دھونے لگی۔ پانی کے چھینٹے نیچے رکھے برتن

میں جا کر گر رہے تھے اور کچھ اس کی چادر پر بھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔

"لیکن وہ تو بہت وڈا (بڑا) ہوتا ہے جی۔"

"کوئی بھی چیز انسان کے یقین سے بڑی نہیں ہوتی سکینہ! یہ یقین ہی تھا جس نے دو بھائیوں کے خوابوں کو پر لگا دیے تھے اور انہوں نے جہاز بنا ڈالا تھا تا کہ وہ اڑ سکیں اور اڑ کر نیلے آسمان کو چھو سکیں۔" اس نے مٹھی میں آئے پانی کو آسمان کی طرف اچھال دیا جہاں پرندے اپنے یقین کے پر لیے اڑ رہے تھے۔

"وڈے لوگوں کی وڈی باتیں جی۔" سکینہ کچھ بھی نہیں سمجھی تھی اور اس نے ذہن پر مزید زور ڈالنے کی بجائے کندھے پر رکھا صاف تولیہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم بھی سمجھ جاؤ گی۔" اس نے مسکرا کر تولیہ تھاما اور ہاتھ خشک کرنے کے بعد اسے واپس پکڑا دیا۔ جب تک فیقا چودھری صاحب کے لیے حقہ گرم کر لایا تھا۔ چودھری ہدایت رسول کی عادت تھی کہ وہ ناشتے کے فوراً بعد چار پانچ کش حقے کے ضرور لگایا کرتے تھے۔

"تمباکو نوشی صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی ابا جی!" اور اسے ہمیشہ غصہ آجایا کرتا تھا۔ چودھری صاحب کا سانس اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا تھا لیکن حقہ پینے سے وہ باز نہیں آتے تھے۔

"تجھے پیلٹ (پائلٹ) بننے بھیجا ہے دھی رانی، ڈاکٹرنی نہیں۔" وہ ہنس کر اس کی بات ٹال دیتے تھے

"ابا جی! آپ بھی نا۔" وہ غصہ کرتی اندر کی جانب بڑھ گئی اور جب تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو پہیوں والا سوٹ کیس اپنے ساتھ گھسیٹتی لے آئی تھی۔

"یہ صبح صبح کہاں چل دی پتری؟" چودھری صاحب نے دھوئیں کا مرغولہ فضا میں خارج کرتے پوچھا۔

"ہاسٹل جا رہی ہوں ابا جی۔" وہ چادر ٹھیک سے سر پر جمانے لگی۔

"اتنی سویرے کیا لوڑ (ضرورت) پڑ گئی؟" وہ کبھی بھی اتنی صبح ہاسٹل نہیں جایا کرتی تھی۔

"ابا جی! مجھے یاد ہی نہیں تھا کہ آج ہمارا بہت اہم لیکچر ہونا ہے ورنہ میں کل شام ہی چلی جاتی۔" اس نے پیار لینے کے لیے سر ابا جی کے آگے جھکا دیا۔

"اچھا، اچھا۔ اللہ تجھے کامیاب کرے میری دھی رانی۔" انہوں نے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا دی۔

"رب راکھا ابا جی۔"

سکینہ نے اس کا سوٹ کیس لے لیا تھا تا کہ وہ اسے گاڑی تک چھوڑ کر آسکے۔

"اللہ نگہبان۔" وہ اسے گیٹ سے نکلنے تک دیکھتے رہے۔

"حویلی کی رونق تو پھر چلی گئی۔" وہ نم ہوتی آنکھیں پونچھ کر ہمیشہ کی طرح کمرے میں جا کر بند ہو گئے۔

☆☆☆

امتحانات قریب آنے کی وجہ سے لائبریری اس وقت مختلف ڈیپارٹمنٹس کے اسٹوڈنٹس سے بھری نظر آرہی تھی۔ کہیں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی بلکہ اکثر اسٹوڈنٹ شیلفوں کے پیچھے دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ امتحان جب بھی آتے، اس لائبریری کا یہی منظر ہوتا۔ ہر کوئی نفسا نفسی کے عالم میں نظر آتا۔ سب خود غرض ہو جاتے۔ پہلے جو ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے، امتحان آنے پر نگاہیں جھکا کر کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتے یوں کہ جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔

وہ بھی اپنی کلاس فیلو اور اکلوتی دوست ملیحہ کے ساتھ نوٹس تیار کرنے کے لیے ایک ہی میز کے بائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی۔ گلابی رنگ کے کپڑوں میں اس کی رنگت اور بھی گلابی پڑ رہی تھی۔ اس کی لمبی پلکوں نے اس کی گہری بھوری آنکھوں کو گھیر رکھا تھا جب کہ اس کی

inShOt

تیکھی ناک پر چمکتی لونگ اس کے دیہاتی حسن میں اضافہ کر رہی تھی۔ چہرہ پر سکون تھا مگر ہاتھ بڑی تیزی کے ساتھ نوٹ بک پر کچھ لکھ رہے تھے۔

وہ پر سکون تھی مگر وہ پر سکون نہیں بھی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی اسے مسلسل دیکھ رہا ہو۔ اس نے دوپٹا ٹھیک کرنے کے بہانے ذرا کی ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سامنے والی میز پر بیٹھا شخص چوری پکڑے جانے کی وجہ سے فوراً اپنی نظریں کتاب پر جھکا گیا۔

"یہ وہم ہے یا......؟" نوٹ بک پر لکھتے ہوئے اس نے خود سے سرگوشی کی۔

"کیا؟" پاس بیٹھی ملیحہ نے اسے بڑبڑاتے ہوئے سن لیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے فی الحال اسے ٹال دیا۔

"نوٹس پر دھیان دو لڑکی۔" ملیحہ کا لہجہ مشکوک سا تھا جیسے وہ اس کی بات پر یقین نہ کر پائی ہو۔

"اچھا......" وہ دوبارہ سے اپنے نوٹس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

آدھے پونے گھنٹے بعد وہ اپنا کام مکمل کر کے لائبریری سے نکل آئی تھی۔ کرسی چھوڑنے سے پہلے اس نے لاشعوری طور پر اس جانب دیکھا تھا جہاں وہ اپنی کتاب اٹھا کر بنا اس کی طرف دیکھے وہاں سے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

"یہ آپ آج کل کن خیالوں میں گم رہتی ہیں محترمہ؟" ملیحہ ہاتھ میں چپس کا پیکٹ لیے اس کے کمرے میں چلی آئی تھی اور اب اس کے بستر پر بیٹھ کر کمبل اپنی ٹانگوں کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ جاڑے کی راتوں میں اسے شدید سردی لگتی تھی اور ہاسٹل میں کمروں میں ہیٹر چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ جبکہ اس کے برعکس امل سردی اور کمبل سے بے پروا بیڈ کی ٹیک سے پشت جوڑے بیٹھی نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

"خیالات سے زیادہ ان کی بے ربطگی الجھائے ہوئے ہے۔" اس نے ٹیک چھوڑ دی تھی۔

"اور میں پوچھ سکتی ہوں کہ محترمہ کو اس وقت کس کے خیالات الجھائے ہوئے ہیں؟" اس نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"پتا نہیں ملیحہ مجھے کیوں لگتا ہے کہ......" اس نے لفظ تلاشنے کے لیے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا لگتا ہے تمہیں؟" پیکٹ سے چپس کا ایک ٹکڑا نکالنے سے پہلے ملیحہ نے اس سے پوچھا تھا۔

"یہی کہ......کوئی ہے جو مجھے ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ مجھے اس کی نظریں پریشان کیے ہوئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں جانتی ہوں کہ وہ کون ہے۔" آخری جملہ اس نے نہایت تیزی کے ساتھ ادا کیا تھا۔ جیسے کوئی چوری ہو اور اس کی رازداری ضروری ہو۔

"کون؟" وہ متجسس ہوئی۔

"پتا نہیں۔" بے دلی سے کہہ کر اس نے کمبل کھینچ کر اپنے اوپر تان لیا تھا۔

"اب بتاؤ بھی۔" ملیحہ نے کمبل اتار کر پرے پھینک دیا۔

امل نے اسے دیکھا تو وہ اسے ہی گھور رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ ملیحہ اب ایسے ٹلنے والی نہیں تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے وہ نام لے دیا تھا جو وہ آج تک نہیں لے سکی تھی۔

"جہاں داد۔"

ملیحہ کے چہرے کے تاثرات پل بھر میں بدلے تھے۔ شوخی و شرارت کی جگہ غصہ لے چکا تھا۔ ایسا غصہ جس سے امل کو خوف آتا تھا۔ اس سے پہلے کہ ملیحہ غصے سے پھٹ پڑتی وہ خود ہی اپنی صفائی میں بول پڑی۔

"ہو سکتا ہے کہ یہ محض ایک غلط فہمی ہو لیکن......" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ملیحہ برق سی تیزی سے اٹھی اور اس کا کمرا چھوڑ کر چلی گئی۔

"ملیحہ! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ چلا چلا کر اپنا دفاع کرنے لگی۔

"تم جانتی ہو کہ میں......" اس سے آگے اس کی آواز رندھ گئی اور ایک دبی سی سسکی نے فضا میں گھل کر اسے مزید نم کر دیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن ملیحہ اسے بنا بتائے ہی ہاسٹل سے گھر چلی گئی تھی۔ ازل صبح سے کئی بار اسے کال کر چکی تھی مگر وہ اس کی کسی کال اور کسی میسج کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ اس کے گھر جانے کی اطلاع بھی ازل کو وارڈن سے ہی ملی تھی۔ اس کے بغیر یونیورسٹی آنا ازل کو ہمیشہ برا لگتا تھا۔ ازل کسی کو بھی دوست نہیں بناتی تھی ملیحہ سے بھی اس کی دوستی اچانک

ہوئی تھی۔ وہ کلاس کی پہلی لڑکی تھی جس کے ساتھ ازل پہلے دن کلاس بینچ پر بیٹھی تھی۔ وہ ملیحہ کے بغیر اس یونیورسٹی میں ہمیشہ خود کو اکیلی محسوس کرتی تھی۔

ابھی بھی ازل ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی اسے کال ملا ہی رہی تھی کہ تبھی اسے وہاں کسی کی آمد کا احساس ہوا۔

"آپ کی دوست نہیں آئی آج؟"

اس آواز پر ازل نے چونک کر دیکھا تو سامنے جہاں داد اپنی ساحرانہ شخصیت لیے کھڑا تھا۔ اسکول آف ایوی ایشن کا یونی فارم پہنے وہ اس صدی کا سب سے ہینڈسم پائلٹ کہلا سکتا تھا۔ ایسا ازل نے سوچا تھا اور وہ اس شخص کے بارے میں ہمیشہ ایسا ہی سوچا کرتی تھی۔

"یہ تو آپ کو پتا ہوگا۔" وہ ہنک کر بولی۔

اس وقت وہ بھی یونی فارم میں تھی مگر وہ سفید شرٹ کے بجائے قمیص کو ترجیح دیتی تھی اور سر پر یونی فارم کا اسکارف اوڑھے، بازوؤں کے گرد سیاہ چادر لپیٹے وہ سب سے الگ ہی نظر آتی تھی۔

"ہیں؟ مجھے کیوں پتا ہوگا؟" وہ انجان بنا تھا۔

"کیونکہ وہ آپ کی کزن ہے، میں نہیں۔" وہ دوبارہ نمبر ملانے لگی۔ سورج کی کرنیں براہ راست اس کے صبیح چہرے پر پڑ رہی تھیں جن کی حدت سے اس کا گلابی چہرہ سرخ پڑ رہا تھا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اسے سورج کی کرنوں سے لاڈ اٹھوانا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

"تو آپ کو افسوس ہو رہا ہے کہ وہ میری کزن ہے اور آپ نہیں؟" اس نے خود سے اندازہ لگانے کے سے انداز میں کہا۔

ازل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اسے نظر انداز کرتی ملیحہ کے نام ایک پیغام ٹائپ کرنے لگی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"نہیں۔" اب کی بار اس کی طرف سے دوٹوک جواب آیا تھا۔

"شکریہ۔" وہ اس کے قریب ہی کچھ فاصلے پر پچھلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

"مگر میں نے "نہیں" کہا تھا۔" اس نے لفظ "نہیں" پر زور دیتے ہوئے ناگواریت کا اظہار کیا تھا۔

"تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔" جواباً اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ویسے دنیا کے نہایت ہی فارغ ترین انسان ہیں آپ جو ہر وقت لڑکیوں کو تاڑتے رہتے ہیں اور پھر ان کے منع کرنے کے باوجود ان کے پاس یوں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔" رات والی بات کا ری ایکشن وہ اس طرح سے دے رہی تھی۔

"او وور تھنگی؟"

"لیکن میں نے تو کبھی کسی لڑکی کو نہیں تاڑا اور نہ ہی اس کے پاس کبھی جا کر یوں بیٹھا ہوں۔" نظریں اس کے سرخ پڑتے چہرے پر جمائے وہ اپنے دفاع میں بولا۔

"میں نے خود آپ کو لائبریری میں یہ حرکت کرتے دیکھا تھا۔ کیسے ٹکٹکی باندھے دیکھے ہی جا رہے تھے۔ بھئی کوئی خدا کا خوف بھی ہوتا ہے کہ پکڑے جانے کی صورت میں کیا انجام ہوگا۔ مگر نہیں، موصوف تو ڈنکے کی چوٹ پر سب کرتے نظر آتے ہیں۔" وہ غصے سے لال پیلی ہری نیلی سب ہو رہی تھی جبکہ جہاں داد رخ اس کی طرف موڑے، تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے اسے ابھی بھی بے خوف سا دیکھ رہا تھا۔

"وہ تو اتفاقاً میری نظر تم پر پڑ گئی تھی۔"

"اچھا؟ اور اس دن فزکس ڈیپارٹمنٹ کے کوریڈور میں بھی اتفاقاً نظر پڑی تھی کیا؟" وہ نہایت لڑاکا عورتوں کی طرح اس سے تقریباً لڑ ہی رہی تھی۔

"ایک منٹ......" اس سے پہلے کہ وہ مزید آگ اگلتی، جہاں داد نے اسے ٹوکنا ضروری سمجھا

InShOt

تھا۔

"یہ تمہیں کیسے پتا چلتا ہے کہ میں فلاں جگہ پر فلاں وقت میں تمہیں ہی دیکھ رہا ہوں؟"

"بس پتا چل ہی جاتا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"مگر بنا دیکھے کیسے پتا چل جاتا ہے؟" وہ راز جان لینا چاہتا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ یہ کہ میں بھی آپ کو ہی دیکھ رہی ہوتی ہوں؟" اب الجھنے کی باری امل کی تھی اور وہ خود سے ہی الجھ گئی تھی۔ راز افشاں ہو چکا تھا۔

"ہاں بالکل۔" جہاں داد نے اس کی بات کی تصدیق کی تھی۔

"نظر جسے تلاشتی ہے، بے اختیار ہو کر اسی پر جا ٹھہرتی ہے۔" وہ رکا اور توقف سے بولا۔

"تم مانو یا نہ مانو لیکن اس کہانی میں کوئی بھی چیز یک طرفہ نہیں ہے امل۔" اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں پہلے سے زیادہ چمکنے لگی تھیں یا پھر امل کو ایسا لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ امل ان آنکھوں کے سحر کا شکار ہو کر کسی کٹھ پتلی کی طرح اظہار کر دیتی، ایک خوف نے اس کے اندر سر اٹھا لیا تھا۔

"دیکھیے! چاہے یہ جذبات یک طرفہ ہیں یا پھر دو طرفہ۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ جو آپ چاہ رہے ہیں ویسا نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کے بارے میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔ امید ہے کہ اس انکار کے بعد آپ مجھے دوبارہ پریشان نہیں کریں گے......" خود پر قابو کر پاتی وہ اپنے جذبات کی نفی کر گئی تھی۔ "ملیحہ بہت اچھی لڑکی ہے اور آپ سے بہت محبت بھی کرتی ہے۔ بہت خیال رکھے گی آپ کا۔ ہو سکے تو میرے بجائے اس کے بارے میں ضرور سوچیے گا۔" اٹھنے سے پہلے وہ ملیحہ کی بات اس تک پہنچانا نہیں بھولی تھی۔

"بے فکر رہو۔ تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔" نجانے کیوں وہ مسکرا دیا تھا۔ امل دیکھ سکتی تھی کہ اس کی مسکراہٹ میں رنج و الم کی اتنی شدت تھی کہ اگر وہ قہقہہ بھی لگاتا تو آنکھوں سے صرف آنسو ہی جاری ہوتے۔ وہ بت بنے اس کی رنجیدہ سی مسکراہٹ دیکھتی رہی۔

"لگتا ہے مجھے ہی یہاں سے جانا پڑے گا۔ ورنہ پھر کہو گی کہ میں دنیا کا فارغ ترین انسان ہوں جو یونیورسٹی کی لڑکیوں کو یوں تمہاری طرح بت بنے گھورتا رہتا ہوں۔"

"امل کے بت بنے وجود کو اپنے طنز کے وار سے چکنا چور کر کے وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس کی اٹھی ہوئی مغرور سی ناک اس پل تکلیف کے احساس سے سرخ ہو رہی تھی جبکہ روشن سیاہ آنکھیں پل بھر میں بجھ سی گئی تھیں۔

وہ دو سیڑھیاں اور اتر کر اس کے قریب چلا آیا اور اس کی گہری بھوری آنکھوں میں جھانک کر الوداعی بات کہنے لگا۔

"یہ دیکھو! میری محبت کی لاش ڈیپارٹمنٹ کی ان سیڑھیوں پر پڑی ہے اور اس کا خون تمہارے ہاتھوں پر لگا ہوا ہے۔ ہو سکے تو جانے سے پہلے مٹھی بھر مٹی اس پر ڈال جانا تاکہ محبت کے قتل کا تھوڑا سا کفارہ ادا ہو سکے۔"

"یہ آخری بات تھی جو اس نے جاتے سے کہی تھی۔ اس کے بعد وہ رکا نہیں کیونکہ امل نے اسے روکا نہیں تھا۔ اگر وہ اسے آواز دیتی تو وہ وہیں رک جاتا اور رک کر عمر بھر کے لیے مجسمہ ہو جاتا۔

مگر ایسا ہوا نہیں۔ ضروری تو نہیں کہ زندگی کی کہانی میں سب کچھ کرداروں کی مرضی کے مطابق ہی ہو۔ کبھی کبھی کچھ فیصلے کہانی کار کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ امل اور جہاں داد کی زندگی کا فیصلہ بھی قلم کی نوک سے تحریر کر دیا گیا تھا مگر کون جانے۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ جاڑے کی راتیں بہت لمبی ہوتی ہیں لیکن شب فراق کی طوالت صرف وہی جان سکتا ہے جس نے یہ رات برہا کی تپتی سڑک پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے کاٹی ہو۔ تو وہ بھی آج یہ رات کاٹ رہی تھی اور یہ جان رہی تھی کہ جاڑے کی راتیں تو پلک جھپکتے ہی گزر جاتی ہیں، یہ تو شب فراق ہے جسے کاٹتے کاٹتے شاید صدیاں

InShOt

گزر جاتی ہیں مگر وقت گزر جاتا ہے اور انسان وہیں کھڑا رہتا ہے جہاں ہجر کی شب شروع ہوتی ہے۔ وہیں جہاں بربادی کی سڑک پر پہلا قدم پڑتا ہے۔

ہاسٹل میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی وہ چاند کو اپنی بے روح نظروں سے تک رہی تھی اور اس وقت کو یاد کر رہی تھی جب اس نے پہلی بار جہاں داد کو ملیحہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ ملیحہ اس کے ساتھ کینٹین میں بیٹھی کسی بات پر بحث کر رہی تھی۔ جواباً وہ بھی دبے دبے انداز میں تقریباً چلا ہی رہا تھا لیکن نجانے کیوں ال پر پہلی نظر پڑتے ہی وہ خاموش ہو گیا تھا یوں کہ جیسے اپنی بات، اپنی ذات سب بھول گیا ہو۔ اس نے بحث میں ہار مان لی تھی۔

دوسری بار وہ اسے ایوی ایشن کے یونی فارم میں ملبوس اپنے ڈیپارٹمنٹ کے کوریڈور میں کھڑا دو لڑکوں کو نہایت نرمی سے کچھ سمجھاتے ہوئے نظر آیا تھا۔

"کوئی بھی چیز انسان کے یقین سے بڑی نہیں ہوتی۔ یہ یقین ہی تھا جس نے دو بھائیوں کے خوابوں کو پر لگا دیے اور انہوں نے جہاز بنا ڈالا۔ تاکہ وہ اڑ سکیں اور اڑ کر نیلے آسمان کو چھو سکیں۔"

اس پل سب آوازیں مدھم پڑ گئی تھیں۔ سماعتوں سے آواز ٹکرا رہی تھی تو بس جہاں داد کی۔ باقی ہر آواز اپنی اہمیت، اپنی حیثیت کھو بیٹھی تھی۔

ال کو یاد تھا کہ وہ کئی دن اس آواز کے سحر میں جکڑی رہی تھی۔ پھر وہ اس کو ہر جگہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتی خود کو جہاں داد کی نظروں کے حصار میں پاتی۔ وہ فیصلہ کرنے سے پہلے محبت کر بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جس ماحول سے آئی تھی وہاں محبت کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس نے محبت خود تھوڑی کی تھی۔ اسے تو محبت ہو گئی تھی۔ یہ محبت کا آسیب ہوتا ہی ایسا ہے۔ خود ہی چمٹ جاتا ہے اور جب چمٹ جائے تو پھر جان چھوڑتا ہی کہاں ہے۔

ال کو بھی جانے انجانے میں مرض لگ چکا تھا۔ وہی جسے "محبت" کہا جاتا ہے۔ وہی جسے "لاعلاج" سمجھا جاتا ہے۔

☆☆☆

اگلے دن وہ خود بھی ہاسٹل سے گھر آ گئی تھی اور آتے ہی اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ شاید وہ محبت کے قتل کے جرم میں خود کو قید کی سزا دینا چاہتی تھی۔ چودھری ہدایت رسول کسی کام کے سلسلے میں شہر گئے ہوئے تھے ورنہ وہ اسے یوں کمرے میں اتنی دیر کبھی بھی بند نہ رہنے دیتے۔

"ال باجی!" سکینہ دروازے پر دستک دے کر اندر آ گئی۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ سفید کھڑکیوں پر گرے گہرے جامنی پردے روشنی کو اندر آنے سے روکے ہوئے تھے۔

وہ آواز سن کر ذرا سا کسمسائی تھی۔ سکینہ نے آگے بڑھ کر پردے سرکائے تو روشنی نے سرعت سے اندر آ کر ہر چیز پر اپنا راج جما دیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے ال باجی؟ جب سے آئی ہیں کمرے کی ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔" وہ کمرے میں پھیلی چیزیں سمیٹ کر ان کی مقررہ جگہ پر رکھنے لگی۔

ال نے آنکھیں مسل کر دیکھا تو وقت کا اندازہ ہی نہ لگا پائی۔ یوں جیسے زماں و مکاں سب وہیں رہ گئے تھے۔ وہیں ڈیپارٹمنٹ کی کسی سیڑھی پر۔

"کیا فرق پڑتا ہے سکینہ! جب اندر کا موسم ہی اچھا نہ ہو تو باہر نکل کر کیا دیکھوں۔" وہ اپنے لمبے ریشمی بالوں کو کیچر میں مقید کرتی اٹھ بیٹھی۔

"یہ ہار کتنا سوہنا ہے جی۔" ال کی بات کو سنے بنا وہ ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے نیکلس کو ستائشی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ال نے بے دلی سے اسے دیکھا اور پاؤں میں چپل پہن کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔

املتاس کے درختوں پر پیلے پھول اگ آئے تھے۔ نہیں، وہ تو کانٹے تھے۔ ال کو بغور دیکھنے پر ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ پیپل کے درخت پر بیٹھ کر کوکنے والی کوئل آج نہیں آئی تھی۔ یا پھر آئی تھی لیکن ال کو ہی اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"آپ جیسی حویلی میں رہنے والی شہزادیاں

InShOt

بہت خوش قسمت ہوتی ہیں جی۔ جب دل چاہا نت نئی چیزیں خرید لیں۔ جنہیں ایک بار پہنا اور پھر یوں پھینک دیا۔" وہ ابھی بھی نیکلس کو پکڑے کھڑکی اسے عجیب سے پن سے دیکھ رہی تھی۔

اہل کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نے جگہ بنائی تھی۔

"کبھی ان شہزادیوں سے پوچھنا کہ وہ کتنی بد بخت ہوتی ہیں۔"

سامنے برگد سے ایک گلہری نیچے اتر آئی تھی اور اب کسی چیز کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔

"وہ کیوں باجی؟" سکینہ نیکلس چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔ کم از کم اسے اہل کبھی بھی بد بخت نہیں لگی تھی۔

"کیونکہ انہیں محبت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔" چرمر کرتے پتوں پر دوڑتی گلہری بہت مایوس دکھائی دے رہی تھی۔

"تے محبت کر کے کی کرنا اہل باجی۔" وہ انگلی دائیں گال پر رکھ کر حیرت سے بولی۔

"محبت میں بھی نفع نقصان ہی تو سمجھ میں نہیں آتا جھلی۔" وہ تھکے سے مسکرائی۔ جیسے اپنی ہی حالت پر ترس کھا کھا کر تھک گئی ہو۔

"مجھے لگتا ہے آپ کے سر پہ پڑھائی کا بہت بوجھ ہے۔ تیل لگا کر مالش کر دوں؟" اس نے اہل کے اس الجھے مسئلے کا کیا خوب حل نکالا تھا۔

"اگر کوئی دم ہے تو وہ پڑھ کر مجھ پر پھونکو کہ عشق کے آسیب سے رہائی ممکن نظر نہیں آ رہی۔"

گلہری خالی ہاتھ واپس برگد پر چڑھ گئی تھی۔ اہل نے پردے کھڑکی کے آگے کر دیے اور یوں منظر ایک بار پھر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔

☆☆☆

"کی ہو گیا اے میری پتری نوں؟ اپنے ابا جی کو آنے کی اطلاع وی نہیں دتی۔" اگلی صبح وہ بے دلی کے ساتھ ان کے سامنے حویلی کے عقبی حصے میں موجود تھی۔ یہ حصہ ایک چھوٹے سے لان کے جیسا تھا جہاں بچھی سبز گھاس آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پیپل اور املتاس کے درخت لان کے زیادہ حصے پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ برگد باہر تھا مگر اس کا آدھا حصہ اندر کی طرف آتا تھا۔

وہ عقبی حصے کے وسط میں رکھے جھولے پر بیٹھی اپنے ابا جی کو دیکھ رہی تھی جن کے چہرے پر خوشی و حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"کبھی کبھی سرپرائز بھی تو دینا چاہیے ابا جی۔" جھولے کو دھیرے سے ہلاتے ہوئے وہ مسکرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

"چنگا کیتا ای پتری۔ تھوڑی دیر میں وکیل صاب بھی آنے والے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ جیتے جی زمین کا رولا ختم کر جاؤں۔ ورنہ اپنے بھائیوں کو تو تو جانتی ہی ہے اچھے سے۔" اخبار کا صفحہ پلٹنے سے پہلے انہوں نے حقے کی نے کو منہ سے لگا کر فضا میں دھواں خارج کیا تھا۔

"ایسا کیوں کہہ رہے آپ؟" ان کے منہ سے نکلنے والے ایسے الفاظ اسے ہمیشہ اداس کر دیتے تھے اور وہ ایسی باتوں پر ہمیشہ ان سے خفا ہو جایا کرتی تھی۔

"اولاد اگر عیاش ہو تو والدین کو بہت کچھ وقت سے پہلے ہی کرنا پڑتا ہے دھی رانی۔" ان کے چہرے پر پھیلی پریشانی دیکھ کر وہ پچھتاتے خاموش رہی۔

"صفیہ بھرجائی آ گئی واپس۔" اس نے اپنی بڑی بھابھی کے بارے میں پوچھا جو پچھلے ایک مہینے سے روٹھ کر اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی جبکہ چھوٹی بھابھی نبیلہ حویلی کے اس حصے میں کم ہی آتی تھی۔

"اللہ جانے۔" چودھری صاحب اپنی دونوں بہوؤں سے اتنا ہی ناخوش تھے جتنا اپنے دونوں بیٹوں سے۔ اور وجہ ان کی سازشیں تھیں جو وہ ہر وقت ہر انسان کے خلاف کرتی رہتی تھیں۔

اہل کا بڑا بھائی شاہ نواز بے حد عیاش تھا اور کئی عورتوں سے ناجائز تعلقات کی وجہ سے اس کی اپنی بیوی سے ان بن ہی رہتی تھی۔ جبکہ چھوٹا بھائی دلاور جوا کھیلنے کا اس قدر عادی تھا جیسے کوئی نشئی نشے کا عادی ہو۔

InShOt

دونوں بھائی انہی چکروں میں بہت سارا پیسہ اڑا چکے تھے اور جائیداد کا ایک بڑا حصہ ہڑپ کر چکے تھے۔
اپنی بگڑتی طبیعت کی وجہ سے چودھری صاحب جلد از جلد اہل کا حصہ اس کے نام کر دینا چاہتے تھے۔
"کتنے دنوں کے لیے آئی ہے پتری؟" اس کی طرف سے گہری خاموشی پا کر وہ خود ہی استفسار کرنے لگے۔
"کاش! میں اب دنوں کا حساب کتاب لگا پاتی ابا جی۔" ایک ٹھنڈی سانس اس نے پرنم فضا کے سپرد کی تھی۔
"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کوئی بات تو چھپا رہی ہو؟" انہوں نے اخبار سامنے پڑی میز پر رکھ کر اسے جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"میں کیا چھپاؤں گی ابا جی؟" وہ جز بز سی ہوئی۔
"وہی جو تیرے دل میں ہے اور تجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔"
"بے فکر رہیں۔ کبھی میرے دل میں کچھ بھی ہوا تو سب سے پہلے آپ کو ہی بتاؤں گی۔" وہ مسکرا کر ان کی بات ٹال گئی تھی۔
"پکی گل (بات) ہے نا؟" وہ حقے کی نے دوبارہ منہ سے لگا چکے تھے۔
"سو فیصد پکی بات ہے۔" اس بار وہ ساری قوت جمع کر کے مسکرائی تھی تاکہ اس کی بے جان سی مسکراہٹ اس کے ابا جی کو مزید پریشان نہ کر سکے۔ اس موقع پر آج اسے اپنی ماں بہت یاد آئی تھی۔ کاش وہ زندہ ہوتیں تو اب تک وہ انہیں اپنا راز دار بنا چکی ہوتی۔

☆☆☆

تین دن گھر میں گزار کر اسے ہاسٹل واپس ہی آنا پڑا۔ آخر وہ کب تک جہاں داد سے چھپنے کے لیے چھٹیاں کر سکتی تھی۔ یہاں آ کر اہل نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ اس کی نظر اب بے اختیار ہو کر کسی کو تلاشے گی نہیں۔ وہ ملیحہ، اپنی بہترین دوست کو مزید بدگمان نہیں ہونے دے گی۔
اسی شام ملیحہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ اپنے رویے پر بہت شرمندہ دکھائی دے رہی تھی لیکن یہ شرمندگی کم اور خوشی زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔
"میں نے غلط سمجھا تھا اہل۔" وہ سر جھکائے کہنے لگی۔
"مجھے ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ جہاں داد تم میں انٹرسٹڈ ہے اور تم جہاں داد میں۔"
اس کی آنکھوں میں عجب چمک تھی جو اہل نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔
"تم ہمیشہ یہی کہتی رہیں کہ تم دونوں کے بیچ میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن میں ہی پاگل تھی جو تم پر یقین ہی نہ کر پائی۔" اہل سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں ایسا کیا ہو گیا تھا کہ ملیحہ کو یہ سب کہنا پڑ رہا تھا۔ وہ خاموش سی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی رہی۔
"اگر اس دن جہاں داد ماموں اور ممانی کے ساتھ میرے لیے اپنا پروپوزل لے کر ہمارے گھر نہ آتا تو شاید یہ غلط فہمی مجھ سے بہت کچھ غلط کروا بیٹھتی۔" اس نے اہل کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ تھام لیے تھے۔ "اس نے مجھے پروپوز کر دیا ہے اہل۔"
وہ خوشی سے چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی اور نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی، اہل اس کی کوئی بات نہیں سن پا رہی تھی۔ اسے اس لمحے کہیں دور سے آتی اپنی ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔
"ملیحہ بہت اچھی لڑکی ہے اور آپ سے بہت محبت بھی کرتی ہے۔ بہت خیال رکھے گی آپ کا۔ ہو سکے تو میرے بجائے اس کے بارے میں ضرور سوچیے گا۔"
"بے فکر رہو۔ تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔" اس کا چہرہ نظر کے سامنے ابھرا تھا۔
"لگتا ہے مجھے ہی یہاں سے جانا پڑے گا۔ ورنہ پھر کہو گی کہ میں دنیا کا فارغ ترین انسان ہوں جو یونیورسٹی کی لڑکیوں کو یوں تمہاری طرح بت

InShOt

بے غور تار رہتی ہوں۔" اُل کا سانس رک رہا تھا یا شاید اسے ہی یہ گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھو! میری محبت کی لاش ڈیپارٹمنٹ کی ان سیڑھیوں پر پڑی ہے اور اس کا خون تمہارے ہاتھوں پر لگا ہوا ہے۔ ہو سکے تو جانے سے پہلے مٹھی بھر مٹی اس پر ڈال جانا تاکہ محبت کے قتل کا تھوڑا سا کفارہ ادا ہو سکے۔" اُل نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے تھے اور اب انہیں آنکھوں کے سامنے کیے صدمے سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" ملیحہ کے لیے اس کا یہ ردعمل بہت حیران کن تھا۔

"ہاتھوں پر لگا خون کیسے صاف ہوتا ہے ملیحہ؟" اسے اپنے ہاتھ سرخ دکھائی دے رہے تھے۔

"اگر خون ہو بھی محبت کا؟" وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہیں پائی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" ملیحہ نے نرمی سے اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے استفسار کیا۔

"وہ……ہاں! ٹھیک ہوں۔" اس نے پیشانی مسلی۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم؟" وہ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں سے ہاسٹل کے گھٹن زدہ کمرے میں لوٹ آئی تھی۔ محبت کی لاش تو شاید وہیں رہ گئی تھی جس پر مٹی ڈالنے کا حوصلہ اس میں ابھی تک پیدا نہیں ہوا تھا۔

"میری اور جہاں داد کی منگنی ہے پرسوں اور میں تمہیں انوائٹ کرنے آئی ہوں۔" اُل کی حالت کو یکسر نظر انداز کرتی وہ پھر سے چہکنے لگی۔

"بہت مبارک ہو……ملیحہ……" اس نے خود کو کہتے سنا تھا۔

"شکریہ۔"

"لیکن تم آؤ گی نا؟ دیکھو کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" اس نے انگلی کے اشارے سے تنبیہ کی۔

"ہاں……کیوں نہیں۔" وہ جبراً مسکرا بھی نہیں پائی تھی۔ نجانے کیوں اس کی نظریں ایک بار پھر اپنے ہاتھوں پر جم گئی تھیں۔

سرخ رنگ……

محبت کے خون کا رنگ……اس کے ہاتھوں سے اب اس کے بازوؤں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ اس کینسر زدہ رنگ کو اپنے جسم میں پھیلنے سے روک دینا چاہتی تھی۔ وہ دوپٹے سے اپنے ہاتھ رگڑ رہی تھی۔ ملیحہ پہلے ہی جا چکی تھی۔ سرخ رنگ اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔

"خدا کے لیے"……وہ کسی ان دیکھے سے کہنے لگی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ان التجاؤں میں کتنی دیر دوپٹا ہاتھوں پر رگڑتی رہی تھی۔ رات تک……یا شاید اگلی صبح تک۔

کاش محبت کے سرخ رنگ سے چھٹکارا پانا بہت سہل ہوتا۔

☆☆☆

یہ ملیحہ کے گھر کا لان تھا جس میں اس وقت چراغاں کیا گیا تھا۔ سفید کرسیوں کی دو قطاریں تھیں جن کے بیچ بنی روش پر سرخ قالین بچھایا گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے برقی قمقمے بنگلے کی دیواروں سے لے کر لان کے ہر چھوٹے بڑے پودے پر چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ یوں جیسے جنگل کے سارے جگنو رستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہوں یا پھر ٹمٹماتے تارے جو آسمان سے زمیں پر اتر آئے تھے۔

ملیحہ کا ڈرائیور اُل کو ہاسٹل سے لے آیا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی چند مہمان تشریف لا چکے تھے جن میں سے اکثر چہرے وہ یونیورسٹی میں کہیں نہ کہیں دیکھ چکی تھی۔ ان مہمانوں کو طرح طرح کے مشروبات پیش کیے جا رہے تھے۔

اُل نے سیاہ شلوار قمیص کے ساتھ نیٹ کا دوپٹا سر پر اوڑھ رکھا تھا جس کے کناروں پر چاندی رنگ کے دھاگے سے نفیس سی کڑھائی کی گئی تھی۔ ایک ہاتھ میں سیاہ کانچ کی چند چوڑیاں اور دوسرے میں گولڈ کا باریک سا بریسلٹ پہنے، چہرے پر ہلکا سا

میک اپ کیے وہ اس افسانوی کردار کی مانند نظر آ رہی تھی کہ جس کے حسن کو بیان کرتے کرتے مصنف اپنی کئی راتیں ہاتھ میں قلم پکڑے کاغذ کے پلندوں پر جھکے ہوئے گزار دیتا ہے۔

سرخ قالین سے بنی روش پر چلتی وہ ارد گرد دیکھتی ہوئی ملیحہ کو ڈھونڈ رہی تھی مگر وہ اسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ ال کی کوشش تھی کہ وہ جہاں داد کے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ ملیحہ کو اس کی منگنی کا تحفہ دے کر واپس ہاسٹل چلی جائے۔ لیکن جیسا وہ سوچتی تھی اگر ویسا ہو جاتا تو شاید آج اسے یوں چوری چھپے وہاں نہ جانا پڑتا۔

وہ جس کا سامنا کرنے سے ڈر رہی تھی، اگلے لمحے وہی اسٹیج کے پیچھے سے نکل آیا تھا۔ اس کے ساتھ شاید ایونٹ مینجمنٹ کا کوئی لڑکا تھا جسے وہ کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ ال وہاں سے غائب ہوتی، وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اور دیکھنے کے بعد اپنی بات کہنا بھول چکا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا تھا مگر جہاں داد جب بھی اسے دیکھتا تھا، وہیں پر خاموش ہو جاتا تھا جیسے اسے اپنی ہر بات ال کے سامنے بے مول سی لگتی ہو۔

اس لڑکے کو وہیں پر چھوڑ کر وہ ال کے پاس چلا آیا جو ہونق سی بنی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

سیاہ رنگ کی شلوار قمیص پر سیاہ رنگ کی واسکٹ جس پر گولڈ بروچ چین لگی ہوئی تھی، پہنے وہ سب کی نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ال کو بت بنے دیکھ کر وہ تعجب کیے بنا نہ رہ سکا۔

"تمہاری حالت دیکھ کر لگ رہا ہے کہ شاید تم نے کوئی غیر یقینی منظر دیکھ لیا ہے۔ کیا تم یہاں میری اور ملیحہ کی منگنی کی رسم میں شرکت کرنے کے ارادے سے نہیں آئیں؟" دونوں بازو سینے پر باندھے وہ آج بھی ال کو انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا جن سے بھی اسے یونیورسٹی میں دیکھا کرتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں آج ال کو ان نظروں سے نکلتے ان دیکھے تیر اپنا وجود چھلنی کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

"نہیں، ایسی بات نہیں۔ دراصل میں جانتی نہیں تھی کہ ملیحہ کے پہنچنے سے پہلے آپ یہاں پہنچ جائیں گے۔" جواباً طنز کرتی وہ اپنی حالت پر قابو پا چکی تھی۔

"مطلب تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ملیحہ اس بنگلے کے دائیں حصے میں اور میں بائیں حصے میں۔" اس نے ہاتھ سے اس عالیشان بنگلے کی طرف اشارہ کیا جس کی روشنیوں میں ڈوبی سفید دیواریں ال پر اپنی دہشت سی طاری کر رہی تھیں۔

"ارے ہاں...... میں تو بھول ہی گئی تھی۔" ہاتھ میں پکڑا ایک چھوٹا سا گفٹ باکس دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتی وہ اپنی شرمندگی چھپاتی جبراً مسکرائی تھی۔

"کاش! میں بھی کچھ بھول سکتا۔" نظریں اس پر جمائے وہ تاسف سے بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، ملیحہ وہاں چلی آئی۔

"ارے ال! تم وہاں کیوں کھڑی ہو؟" وہ پر جوش سی اس کی جانب لپکی۔

"وہ میں انہیں مبارک باد دینے کے لیے رک گئی تھی۔" ال اس کے گلے سے لگی کہہ رہی تھی۔

اس کے کہنے پر ملیحہ فوراً اس سے الگ ہوئی تھی اور اب جہاں داد کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہی حسین اتفاق ہے کہ دونوں ایک ہی رنگ میں ملبوس دکھائی دے رہے ہیں۔" ملیحہ اپنی اس حیرانی کو چھپا نہیں پائی تھی۔

"حالانکہ میں نے انہیں بولا بھی تھا کہ یہ میرے ڈریس کے ساتھ میچنگ کریں گے مگر یہ تو میری دوست کے ساتھ میچنگ کر کے آ گئے۔" اپنے گولڈن لہنگے کو ایک نظر دیکھتی وہ مسکراہٹ کے ساتھ طنزاً کہہ رہی تھی۔

InShOt

"یک دل نہ سہی، یک رنگ ہی سہی۔" جہاں داد کے لہجے نے وہاں ان تینوں کے بیچ ایک گہری خاموشی طاری کردی تھی۔ چند ثانیے بعد خاموشی کی اس برف کو جہاں داد کی آواز نے ہی توڑا تھا جواب ملیحہ کی جانب متوجہ تھا۔

"تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو ملیحہ۔" اپنی تعریف پر ملیحہ اس کی پہلی بات بھول گئی تھی۔

"شکریہ۔" وہ ایک ادا سے بولی۔

"چلو، مہمان انتظار کررہے ہیں۔" وہ امل کو وہیں چھوڑ کر ملیحہ کو ساتھ لے کر اسٹیج کی جانب بڑھ گیا۔ امل وہاں سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی اور وہیں ایک کرسی پر ڈھے سی گئی تھی۔

وہ سامنے ہوتا تھا تو امل اس سے لاتعلق ہوجایا کرتی تھی۔ وہ نظر سے دور ہوتا تو اس کی جان لبوں پر آجاتی۔ وہ برہنہ پا کی ایسی تیز تلوار پر چل رہی تھی جس نے اس کے پیروں کو گہرے زخم دے ڈالے تھے۔

اس رات اس نے جانا تھا کہ اپنا دل نکال کر کسی کے ہاتھ میں دے دینے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ منگنی کی رسم شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے لوٹ آئی تھی کہ روح کا جسم سے جدا ہونے کا منظر آنکھوں سے دیکھا ہی کب جاتا ہے۔

☆☆☆

وقت تو جیسے پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے تھے۔ اس کے بہت سارے سینئرز پاس آؤٹ ہوچکے تھے جن میں سے ایک جہاں داد بھی تھا۔

اس نے جہاں داد کو آخری بار اس کی اور ملیحہ کی منگنی پہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک سال کا عرصہ بیت گیا تھا لیکن اتفاق سے کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔ البتہ ملیحہ جان بوجھ کر جہاں داد کی باتیں امل کو بتاتی رہتی۔ اس کے دیے گئے تحفے وہ خاص طور پر یونیورسٹی صرف و صرف امل کو دکھانے کے لیے لاتی یا پھر اسے جلانے کے لیے لاتی۔

امل اسے جتنا بھلانے کی کوشش کرتی، ملیحہ اتنا ہی اس کا ذکر کرتی۔ کبھی کبھی امل کا دل چاہتا کہ وہ اسے خاموش کروادے۔ چیخ چیخ کر اسے جتلا دے کہ اس کی جھولی میں جہاں داد کو ڈالنے والی امل ہی تھی۔ اگر بچپن میں اس کا رشتہ اس کے چچا زاد سے طے نہ کردیا جاتا تو آج جہاں داد کے نام کی انگوٹھی امل کی انگلی میں ہوتی۔

اس کے ابا جی نے بے شک اسے اعلا تعلیم کی اجازت اس کی محبت میں دے دی تھی ورنہ ان کے ہاں تو کوئی لڑکی حویلی کی چار دیواری سے باہر بھی قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ انہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی تو پھر باہر کے لڑکوں سے شادی کرنا تو ویسے ہی گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا جس کی سزا وہ صرف موت کی صورت میں دیتے تھے۔ اسے یاد تھا کہ چند سال پہلے اس کی پھپھو کی بیٹی گاؤں کے کسی لڑکے کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی اور پھر کچھ دنوں بعد اس کی لاش گھر کی بالائی منزل سے ملی تھی۔ کہا گیا تھا کہ اس نے خودکشی کرلی تھی مگر سب جانتے تھے کہ یہ خودکشی سے بڑھ کر قتل کا معاملہ تھا۔ ویسے بھی اس کے ابا جی نے ہمیشہ اس کی ہر خواہش پوری کی تھی تو وہ اب ایسا کوئی بھی قدم اٹھا کر اپنے ابا جی کو خاندان بھر میں رسوا نہیں کرسکتی تھی۔

اس نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی تھی لیکن جہاں داد کا نام اکثر اسے بغاوت پر مجبور کردیتا تھا۔ وہ ہر رات اپنے اندر کی باغی لڑکی سے لڑتی، لڑ کر اسے مار دیتی لیکن نجانے کیوں جہاں داد کا ذکر سن کر وہ دوبارہ زندہ ہوجاتی۔

تو محبت ایسی بلا کا نام ہے، جسے جتنی بار مارا جائے اتنی ہی بار زندہ ہوتی ہے اور زندہ ہونے کے بعد اتنا ہی نقصان پہنچاتی ہے۔

☆☆☆

اس نے خود کو بہت سی چیزوں میں مصروف کرلیا تھا۔ وہ یونیورسٹی کی ایک ایسی سوسائٹی کے ساتھ کام کرنے لگ گئی تھی جو غریب بچوں کو مفت تعلیم دیتی تھی۔ ان بچوں کے لیے ہر ڈیپارٹمنٹ

InShOt

سے فنڈز اکٹھے کیے جاتے اور پھر ان پیسوں سے بچوں میں یونیفارم، کتابیں، بستے اور دیگر ضروری چیزیں تقسیم کی جاتیں۔ وہ سارا دن سوسائٹی ممبرز کے ساتھ کام کرتی۔ ان کی میٹنگز میں جاتی اور پھر کبھی کبھی بچوں سے ملنے اور انہیں پڑھانے بھی چلی جاتی۔

اس کے علاوہ اس نے ایک ایسی تنظیم کی ممبر شپ بھی حاصل کرلی تھی جو جہیز کی رسم کے خلاف جنگ لڑ رہی تھی۔ یوں وہ ہر کام کر رہی تھی جس سے اس کا ذہن مصروف رہتا۔

اسی طرح دیکھتے دیکھتے اس کے چھٹے سمسٹر کے مڈز آگئے تھے۔

وہ گرمیوں کی ایک نارنجی شام تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا نے حبس کم کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے کو لاک لگا کر، نوٹس ہاتھ میں اٹھائے باہر گراؤنڈ میں چلی آئی تھی جو رنگ برنگی لڑکیوں سے بھرا دکھائی دے رہا تھا۔ ان میں سے کچھ لڑکیاں پینڈولم کی طرح آگے پیچھے جھول جھول کر پڑھ رہی تھیں جبکہ کچھ لڑکیاں امتحانات جیسی بلا سے بے خوف سی گراؤنڈ میں بچھے بینچوں پر بیٹھی قہقہے لگا رہی تھیں۔ یہ نیو کمرز تھیں شاید جن کے پیپرز ایک دو ہفتے بعد ہوتے تھے۔

اور چند لڑکیاں کینٹین سے کھانے پینے کی چیزیں ہاتھ میں پکڑے اپنے اپنے ہالز کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔

اِل ایک پرسکون سا گوشہ دیکھ کر وہیں نیچے گھاس پر بیٹھ گئی اور رجسٹر پر بک مارک کیا گیا صفحہ کھول کر پڑھنے لگی۔ ابھی وہ بمشکل دو صفحات ہی دیکھ پائی تھی کہ تبھی ایک لڑکی اس کی جانب دوڑتی چلی آئی۔ وہ اِل کے ساتھ والے کمرے میں ہی رہتی تھی۔

"کیا ہوا عدرت؟" اِل نے اسے یوں اپنی طرف آتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"تم یہاں بیٹھی ہو اور میں نے پورا ہاسٹل چھان مارا ہے۔" وہ اپنا سانس درست کرتی کہنے لگی۔

"کیوں؟"

"وہ وارڈن بلا رہی ہیں تمہیں۔ تمہارے گھر سے فون آیا ہے۔"

"اللہ خیر کرے۔" وہ نوٹس اٹھا کر تیزی سے قدم اٹھاتی وارڈن کے آفس کی طرف آئی تھی۔

"میم؟" اِل دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوگئی۔

"جی اِل! فون کہاں ہے آپ کا؟" وہ عینک کے شیشوں سے اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

"فون تو میرے کمرے میں ہی رہ گیا تھا میم، میں پڑھ رہی تھی نا اس وجہ سے۔" اس نے ثبوت کے طور پر اپنے ہاتھ میں پکڑے نوٹس بے ساختہ آگے کر دیے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ عینک ٹھیک کرتی اپنے سامنے کھلے رجسٹر پر دوبارہ جھک گئیں۔

"وہ عدرت کہہ رہی تھی کہ میرے گھر سے فون......" اس نے یہاں اپنے آنے کی وجہ بتائی تھی جسے وارڈن شاید ضروری نہیں سمجھتی تھیں۔

"تمہارے ابو کی طبیعت نہیں ٹھیک اور"......

اس سے آگے اِل سے کچھ سنا ہی نہیں گیا تھا اور فوراً اپنے کمرے کی جانب دوڑی تھی۔

اس کے موبائل پر کئی کالز آچکی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں بھائیوں کے نمبرز پر کال بیک کی مگر دونوں کا ہی نمبر بند جا رہا تھا۔ گھر کا نمبر ملایا تو کسی نے بھی فون نہ اٹھایا۔

"یا اللہ! سب خیر ہو۔" اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور جسم بری طرح لرزنے لگا تھا۔ وہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے نمبر ملانے کی کوشش جاری رکھے ہوئے تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس نے موبائل وہیں بیڈ پر اچھالا اور الماری سے ضروری سامان لے کر بیگ میں رکھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے اطلاع مل گئی تھی کہ اس کے گھر سے گاڑی اسے لینے آئی ہے۔

وہ وارڈن کو اطلاع دے کر سوٹ کیس دھکیلتی مین گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ کوریڈور سے گزرتے وقت

ملیحہ نے اسے یوں جاتے دیکھا تھا مگر اس سے پوچھنے کے بجائے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

اہل کی ساری غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ ملیحہ اس کی دوست نہیں تھی۔

☆☆☆

ابا جی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور انہیں ہسپتال لے جایا گیا تھا جہاں سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

وہ حویلی کے دالان میں بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی اور زیر لب ہر وہ ورد کر رہی تھی جو اسے اس وقت یاد تھا۔ اس کے دل میں آتے وسوسے اس پر کپکپی طاری کر دیتے تو وہ سر جھٹک کر اپنے خیالات کی سرزنش کر دیتی۔

"ابا جی ٹھیک ہو کر آجائیں گے ان شاء اللہ۔" اس نے خود کو خود سے تسلی دیتے ہوئے سنا تھا۔

اہل کے لیے وہ وقت بہت ہی مشکل تھا کہ کوئی اسے تسلی دینے کے لیے گلے سے نہیں لگا رہا تھا۔

دونوں بھائیوں نے نجانے اپنے فون کیوں بند کر دیے تھے۔ جان تھی کہ لبوں پر آرہی تھی۔ دل تھا کہ سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اس کی دونوں بھابھیاں ایک ہی چارپائی پر بیٹھے ہوئے کن انکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتے ہوئے نجانے آپس میں کیا باتیں کر رہی تھیں۔ اس کی بڑی بھابھی اس کے آنے سے پہلے ہی اپنے میکے سے حویلی آگئی تھی۔ دل سے خیر خواہ ہو کر نہیں، بلکہ دنیا داری کے لیے۔

سکینہ دالان کے ستون کے ساتھ موڑھا رکھے بیٹھی سپارہ پڑھ رہی تھی اور چودھری صاحب کے صحیح سلامت آنے کی دعائیں دل ہی دل میں کر رہی تھی۔

"بھرجائی! کہیں سے تو پتا کریں۔" وہ بے چینی سے ان کی جانب لپکی تھی۔

"ہم کہاں سے پتا کریں؟ تیرے بھرا نے بولا تھا کہ وہ خود ہی اطلاع دے دیں گے۔" ہاتھ میں پکڑی تسبیح پر بنا کچھ پڑھے وہ دانے پہ دانہ گرائی تک کر بولی۔

کچھ ہی دیر میں ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی جس نے اہل کے دل کو ایک لمحے کے لیے بند کر دیا تھا۔ اس نے اپنی ہر سوچ کی نفی کی تھی اور زبان پر جاری ورد کو تیز کر دیا تھا۔

سائرن کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

اس کا وجود خزاں رسیدہ خشک پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔

قریب سے قریب تر...... اردگرد عجب سا شور ابھرنے لگا تھا۔ ماحول گھٹن زدہ ہو رہا تھا۔ ایمبولینس حویلی کے بڑے گیٹ کے سامنے آن رکی تھی۔ گھر کے ملازم گیٹ کی جانب دوڑے تھے۔ ایمبولینس کا پچھلا دروازہ کھل چکا تھا۔

اہل حویلی کی راہداری میں دوڑی چلی آئی تھی۔

پہلے شاہ نواز اور پھر دلاور اترا تھا۔

لیکن جنہیں دیکھنے کے لیے آنکھیں بے تاب تھیں، وہ کہیں نظر نہیں آئے تھے۔

گھر کے ملازم آگے بڑھے اور شاہ نواز کے اشارے پر ایمبولینس سے اسٹریچر اتارنے لگے۔

اہل کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ یوں جیسے جان کنی کا عمل وقت سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

اسٹریچر پر پڑے وجود کا چہرہ سفید کپڑے سے ڈھانپا گیا تھا۔

"کاش! اس کپڑے کے نیچے میرے ابا جی نہ ہوں۔" اس کا دل دعائیں کرنے لگا تھا۔

اسٹریچر حویلی کی راہداری میں لا کر اس کے قریب کھڑا کر دیا گیا تھا۔

وہ کپڑا ہٹانا نہیں چاہتی تھی لیکن صفیہ بھرجائی نے نے برق کی تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے نہایت بے رحمی کے ساتھ کپڑا منہ سے پرے ہٹا دیا

InShOt

تھا۔
ال اس بے رونق چہرے کو مزید دیکھ نہیں پائی تھی اور بے ہوش ہو کر وہیں گر گئی۔
موت کی سفاکی پر زندگی کا رقص ختم ہو گیا تھا۔
اس کے ابا جی نہیں رہے تھے...... وہ جا چکے تھے۔

☆☆☆

ابا جی کو اس دنیا سے گئے ہوئے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ اس کے اردگرد سب کچھ معمول کے مطابق ہونے لگا تھا۔ ایک بس وہی تھی جو معمول کے مطابق کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں تو جیسے ابا جی کے دم سے چلتی ہوں۔ اب وہ نہیں رہے تھے تو وقت بھی چلتا محسوس نہیں ہوتا تھا۔
وقت تو وہیں ٹھہر گیا تھا۔ شام کے اس لمحے میں جب وہ انہیں وداع کر کے ہاسٹل گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہمیشہ کی طرح پیار دے رہے تھے۔
"اس دفعہ جلدی آجانا پتری۔"
"ابا جی! امتحان شروع ہو رہے ہیں میرے۔ اتنی جلدی نہیں آسکتی میں۔" وہ سر پر چادر ٹھیک کرتی بالائی منزل کی سیڑھیاں اترنے لگی۔
"پھر تجھے ہی شکایت ہوگی۔" وہ نروٹھے پن سے بولے۔
"کوئی شکایت نہیں ہوتی ابا جی۔ آپ بس اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ آخری زینے پر کھڑی ہو کر اوپر دیکھنے لگی۔ چودھری ہدایت رسول چہرے پر اداسی لیے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
اسے اس لمحے سے پہلے ابا جی ایسے کبھی نظر نہیں آئے تھے۔
"خود ہی آکر رکھ لینا خیال۔" اداسی گہری سے گہری ترین ہوتی جا رہی تھی۔
"ابا جی! دو ہفتوں کی ہی تو بات ہے یوں پلک جھپکتے ہی گزر جائیں۔" دائیں ہاتھ سے چٹکی بجا کر کہتی وہ ایک دو زینے اوپر چڑھ آئی تھی۔
"ہاں پتری! دو ہفتوں کی ہی تو بات ہے۔" الہام کا نجانے وہ کون سا لمحہ تھا جس نے اس کے ابا جی کو قید کر لیا تھا۔
"اللہ حافظ ابا جی۔" وہ الہام کے اس لمحے کو نظر انداز کرتی سیڑھیاں اتر گئی تھی۔
"رب راکھا میری دھی رانی۔" وہ اسے خود سے دور جاتا دیکھ کر ہولے سے بولے تھے۔
"کاش ابا جی! کاش مجھے علم ہوتا کہ ان دو ہفتوں میں یہ سب ہو جانا ہے تو میں کبھی بھی نہ جاتی۔" وہ چودھری ہدایت رسول کے کمرے میں تھی جہاں ان کی مہک ان کے زندہ ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے تھے مگر ال کو وہ ہر لمحے اپنے اردگرد محسوس ہوتے تھے۔
وہ ہاسٹل جانے سے پہلے اس کمرے میں آئی تھی اور اب یہاں سے جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور ابا جی کے کمرے سے نکل آئی۔ نہ چاہنے کے باوجود اسے ہاسٹل جانا پڑ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ فائنلز سے پہلے ٹیسٹ دے دے تاکہ بعد میں اس پر پڑھائی کا بوجھ زیادہ نہ ہو۔
سکینہ اس سے آگے چلتی اس کا سامان حویلی کے دالان میں لے آئی تھی جہاں ابا جی کی چارپائی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی گئی تھی۔
اس نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ اب کون تھا وہاں جو کہے گا کہ "پتری! اس بار جلدی آجانا۔"
برآمدے سے نکلتے وقت آنسوؤں کا ریلا اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ چادر سے آنکھیں صاف کرتی وہ گیٹ کی جانب راہداری پر قدم رکھنے ہی لگی کہ تبھی عقب سے اسے خلاف معمول شاہ نواز کی آواز سنائی دی۔
"کہاں جا رہی ہے تُو؟"
وہ اس آواز پر چونک کر رک گئی تھی۔
"بھرا! میں ہاسٹل جا رہی ہوں۔" اس نے وہیں ایڑیوں کے بل پلٹ کر جواب دیا۔

InShOt

سکینہ سوٹ کیس لے کر اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔
"کیوں؟" شاہ نواز چہرے پر عجب سے تاثرات لیے اس کے قریب چلا آیا۔
"بھرا! میرے امتحان رہ گئے تھے اور میں......" وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پائی تھی کہ وہ پہلے ہی گرج اٹھا۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے ہاسٹل شاسٹل جانے کی۔ گھر میں رہو۔ تمہارے اباجی تو رہے نہیں، اب میں کہاں اپنے کام چھوڑ کر تمہاری حفاظت کرتا پھروں گا۔" شاہ نواز کی نشے سے مخمور آنکھیں اس وقت بمشکل کھل رہی تھیں مگر اس کی آواز میں اس قدر رعب تھا کہ امل کچھ بتا بے گنگ سی رہ گئی۔
"لیکن میرا آخری سال شروع ہونے والا ہے۔" اس نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔
"کہہ دیا ناں۔ گھر میں رہو اور اپنی بھرجائیوں سے گھر داری سیکھو۔ کل کلاں کو تمہیں رخصت بھی تو کرنا ہے۔" وہ اپنا حکم سنا کر سکینہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔
"یہ سامان اس کے کمرے میں رکھو اور چوکیدار سے کہہ دینا کہ گھر میں آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھے۔ اور ہاں! کیا نام تھا بھلا اس لڑکے کا؟" اس نے پیشانی مسلتے ہوئے نام یاد کرنے کی کوشش کی۔
"ہاں، جہاں داد...... اگر وہ دوبارہ نظر آئے تو اسے گولی مار دے۔ شریفوں کے گھروں میں اب یونیورسٹی کے لڑکے بھی آنے لگے ہیں۔" امل پر نخوت بھری نگاہ ڈال کر وہ برآمدے کے آخری دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔
جہاں داد کا نام سن کر اس کا دل عجب سے خدشے سے بھر چکا تھا۔
"وہ یہاں کیا لینے آیا تھا؟"
"امل باجی!" سکینہ نے اس کے قریب آ کر اسے پکارا تھا۔
"ہاں؟" وہ چونکی۔
"یہ سامان اندر رکھ دوں؟"
"ابھی کے لیے رکھ دو اور سنو! چوکیدار سے جہاں داد کے بارے میں کچھ نہ کہنا، میں خود ہی جہاں داد کو منع کر دوں گی۔" گالوں پر پھسلتے آنسو تیزی سے رگڑ کر صاف کرتی وہ وہیں موڑھے پر بیٹھ گئی جس کے سامنے کبھی اباجی کی چارپائی بچھی ہوتی تھی اور وہ اس وقت اسے دعاؤں کے سائے تلے رخصت کیا کرتے تھے۔ جب تک وہ گیٹ سے نکل نہ جاتی وہ اسے دیکھتے ہی رہتے اور کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونکتے رہتے۔
مگر اب یوں دعاؤں تلے رخصت کرنے والے اس کے اباجی نہیں رہے تھے۔
دعاؤں کا حصار ٹوٹ چکا تھا اور حادثات نے اسے گھیر لیا تھا۔

☆☆☆

اگلے تین ماہ بڑی تیزی کے ساتھ گزرے تھے۔ اباجی کے لاڈوں سے پلی بڑھی اب بھرجائیوں کی ٹھوکروں پر آ گئی تھی۔ سارا سارا دن وہ ان کی خدمت میں لگی رہتی لیکن پھر بھی ذرا سی غلطی پر دونوں میں سے کوئی ایک اسے ہر روز پیٹ ڈالتی۔
اس کا موبائل اس سے اسی دن چھین لیا گیا تھا۔ وہ جہاں داد سے رابطہ نہیں کر پائی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جہاں داد دوبارہ وہاں آیا تھا یا نہیں۔ باہر کی دنیا سے اس کا ہر رابطہ ختم کر دیا گیا تھا۔ وہ سوکھ کر ڈھانچہ بننے لگی تھی۔ وہ شروع میں چیختی چلاتی تو اس کی آواز حویلی کی اونچی دیواروں سے ٹکرا کر اس کے پاس ہی لوٹ آتی۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ خاموشی کی امربیل اس کی آواز پینے لگی۔
حویلی کی دیواروں کو نہیں یاد کہ آخری بار انہوں نے امل کی درد بھری آواز کب سنی تھی۔
وہ خاموش سی، ڈری سہمی سی سارا دن بیل کی طرح کاموں میں جتی رہتی۔
سکینہ نے اس کی حالت دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ اونچے محلوں میں رہنے والی شہزادیاں خوش قسمت

InShOt

نہیں ہوتیں، بلکہ وہ تو اونچے میناروں میں قید کردی جاتی ہیں جہاں سے کسی کا گزر ہو بھی جائے تو اسے اندھا کردیا جاتا تھا۔

ایسی ہی ایک بدقسمتی نے اس کی زندگی کے دروازے پر پھر سے دستک دے ڈالی تھی۔

شاہ نواز نے چند کاغذات اس کے سامنے لا پھینکے تو امل نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"دستخط چاہئیں ان پر تمہارے۔" اس نے پین کا ڈھکن اتار کر امل کی جانب بڑھا دیا۔

"یہ کس چیز کے کاغذات ہیں؟" اس کے پپڑی زدہ ہونٹ نقاہت سے ہلے تھے۔

"تیرے ابا جی کی ناانصافی کے۔" پیچھے کھڑا دلاور آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹتے ہوئے یوں بولا تھا جیسے ابا جی سے ان دونوں بھائیوں کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ شاید واقعی نہیں تھا۔

امل نے سہم کر ایک ایک کاغذ دیکھا تو ان کے مطابق وہ اپنی جائیداد اپنے دونوں بھائیوں کے نام بنا کسی دباؤ کے کررہی تھی۔ لمحوں میں اس کا سن ہوا دماغ بیدار ہوا تھا اور اس نے کرنٹ کھا کر کاغذات چارپائی پر پھینک دیے تھے۔

"ناانصافی تو آپ لوگ کررہے ہیں میرے ساتھ۔" وہ خود میں ساری ہمت جمع کرتی ان کے بالمقابل کھڑی ہوگئی تھی لیکن اگلے ہی لمحے شاہ نواز کے زوردار تھپڑ نے اسے دوبارہ چارپائی پر گرا دیا تھا۔

"میرے سامنے بکواس کررہی ہے تو؟ یہیں زندہ گاڑ دوں گا تجھے۔" وہ اول فول بکتے ہوئے اس پر دھاڑنے لگا۔

"اس پر دستخط کرو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

"میں آپ لوگوں کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ یہ جائیداد میرا حق ہے اور آپ مجھ سے میرا حق نہیں چھین سکتے۔"

آنکھوں سے بہتے آنسو اس کی آواز بھگونے لگے تھے۔

"تو ٹھیک ہے۔ پھر کوٹھری میں پڑی زندگی بھر گلتی سڑتی رہنا۔" یہ کہہ کر وہ دونوں پھنکارتے ہوئے باہر چلے گئے۔

امل نہیں جانتی تھی کہ وہ کس کوٹھری کی بات کرکے گئے ہیں اور یہ بات وہ رات کو جان چکی تھی جب اس کا منہ اور ہاتھ پیر باندھ کر اسے گاؤں کے باہر ایک ویران گھر میں بند کردیا گیا تھا۔

وہ احتجاج کرتی رہی، ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے منتیں کرتی رہی مگر انہیں ترس نہ آیا۔

یہ ویران سا گھر کئی سال پہلے شاہ نواز اور دلاور کی عیاشیوں کا اڈا ہوا کرتا تھا پھر بعد میں اسے ان عورتوں کے لیے جیل خانہ بنا دیا گیا جو ان دونوں کے بھائیوں کے سامنے ان کی کسی بھی بات سے انکار کردیا کرتی تھیں۔ جو کسی بھی صورت اپنی عزت کا سودا نہیں ہونے دیتی تھیں۔ ان عورتوں پر وہاں اس قدر تشدد کیا جاتا کہ رات کا سناٹا دردناک چیخوں سے گونج جاتا۔

ان چیخوں کے بارے میں جلد ہی مشہور کردیا گیا کہ وہاں جنوں اور چڑیلوں کا بسیرا ہے۔ اس لیے گاؤں کا کوئی بھی توہم پرست فرد اس طرف جانے کی ہمت نہ کرتا۔

اور آج ان عورتوں میں اسے بھی شامل کردیا گیا تھا جن کی سسکیاں ہوا کے پردوں پر نقش ہوگئی تھیں۔ جن کے آنسو سوکھ گئے تھے اور آہیں دم توڑ گئی تھیں۔

افسوس! اڑنے سے پہلے ہی اس کے پر ٹوٹ چکے تھے اور وہ زمین پر گر پڑی تھی۔

☆☆☆

دیے کی مدھم سی لو میں اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اردگرد کے ماحول سے شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ سلاخ دار دروازے کے اس پار سے ایک سسکی اسے سنائی دی تو وہ ڈر سے سہم

InShOt

کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔

"کوئی ہے یہاں؟"

سسکی ایک بار پھر کہیں سے اٹھی تھی اور اب کی بار آواز بہت واضح تھی۔

"شاہ نواز بھرا؟" اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ اسے دیوار پر بنتے اپنے ہی سائے سے خوف آرہا تھا۔

وہ اندھیروں کی عادی نہیں تھی اور اندھیرے بھی ایسے کہ جن سے وحشت کے بھوت نکل کر اس کی اور بڑھ رہے تھے۔

"ولاور بھرا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ ہمت کر کے چلائی مگر آواز سوکھے لبوں کے پیچھے ہی کہیں دب کر رہ گئی تھی۔

سسکیوں کی آواز مسلسل آنے لگی تھی۔

"ابا جی؟"

"کون ہے اس طرف؟"

"ایک دم توڑتی...... عورت۔" ایک مریل سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ خود میں حوصلہ جمع کرتی ذرا سا دروازے کی جانب سرک گئی۔

"کہاں ہو تم؟" اہل نے کان دروازے کے ساتھ لگا کر اس کا جواب سننا چاہا۔

"اسی۔ کمرے...... میں۔"

اب کی بار سسکی آواز بہت قریب سے اٹھی تھی۔ اہل ڈر کے مارے کرنٹ کھا کر پلٹی تو کمرے کے بائیں کونے میں اسے ایک ہیولا سا نظر آیا جو چراغ کی مدھم روشنی میں نہایت بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔

"پانی دے دو...... خدا کا واسطہ ہے۔" ہیولے کے لب ہلتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

اہل کچھ ثانیے بے حس و بے حرکت اسے دیکھتی رہی اور پھر اس کے انسان ہونے کا یقین کر کے اس کی جانب بڑھ گئی۔

"پانی۔" دم توڑتی آواز وقفے وقفے سے ابھر رہی تھی۔

اہل نے اٹھ کر طاق میں سے چراغ اٹھایا اور اس کی لو میں پانی تلاش کرنے لگی۔ دروازے کے قریب ہی مٹی کا ایک گھڑا رکھا تھا جس کے قریب پڑا مٹی کا ایک گندا سا گلاس اوپر کناروں سے تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔

اس نے چراغ ایک طرف رکھ کر گلاس اٹھایا اور پانی سے آدھا بھر کر اس ہونے کی جانب چلی آئی۔

"پانی۔"

"ہاں یہ پیو۔" اہل نے گلاس اس کے لبوں سے لگایا تو وہ گھونٹ گھونٹ کرتی اس طرح پانی پینے لگی جیسے حلق سے نیچے معدے تک سارا رستہ زخمی ہو۔

اس نے چراغ اٹھا کر اس کے قریب کیا تو اسے دیکھتے ہی وہ چیخ اٹھی تھی۔

سامنے بیٹھی اس عورت کا چہرہ زخموں سے بھرا نظر آرہا تھا جن سے رستا خون دیے کی زرد لو میں عجب بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے بے جان پڑتے وجود کو پیچھے کی طرف دھکیلتی دوبارہ دیوار سے جا لگی تھی۔

اسے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ بہت جلد اس کا انجام بھی اس عورت جیسا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وقت کے تھال پر صدیوں کے سکے ایک ایک کرتے گرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے وہاں قید ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا تھا۔ یاد تھے تو بس وہ چہرے جو اس کے سامنے اس کمرے میں دم توڑ گئے تھے۔

زخموں سے چور چہرے کہ جن کی کھال ہمیشہ خون سے تر رہتی۔

ہر تین چار ماہ بعد کوئی نہ کوئی جوان لڑکی یا ڈھلتی عمر کی عورت لا کر اس کمرے میں بند کر دی جاتی جو کچھ عرصہ وہاں درد سے کراہتی رہتی اور پھر بالآخر دم

توڑ جاتی۔

"آخر یہ موت مجھے ہی کیوں نہیں آتی۔" وہ کہہ اٹھتی اور موت کے انتظار میں آنکھیں پھر سے موند لیتی۔

جب وہ اٹھتی تو خود کو پھر سے زندہ پاتی۔

ایک دن شاہ نواز جانے سے پہلے کہہ گیا تھا۔

"گاؤں والوں کی نظر میں تو مر چکی ہے۔ تو ادھر ہی مری رہ۔ باہر جی کر کیا کرے گی۔"

وہ کتنیں ترلے کرتی رہ گئی کہ وہ اس گاؤں سے کہیں دور چلی جائے گی۔ کسی کو اپنی شکل تک نہیں دکھائے گی۔ لیکن کسی نے بھی اس کی کوئی بات نہ سنی اور اسے وہیں پڑا رہنے دیا۔

کچھ مہینوں بعد اس کے ساتھ ایک کم عمر لڑکی کو لا کر کمرے میں ڈال دیا گیا جو شاید اس کے گاؤں کی ہی تھی۔ وہ ڈری سہمی سی لڑکی امل کو یوں وہاں دیکھ کر مزید ڈر گئی تھی۔

"آپ تو مر گئی تھیں؟" وہ لڑکی اس حقیقت سے انکاری ہو رہی تھی جس پر یقین کرنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ "اور وہ بھی کئی سال پہلے"...... اس کے لہجے میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

"کت۔ کتنے سال...... پہلے؟" امل نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے اور اپنے اس عمل کی اس نے کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔

"چھ سال پہلے"...... امل کے یوں قریب آنے پر اس لڑکی نے اسے غور سے دیکھا تو وہ اس امل سے مختلف دکھائی دی تھی جسے گاؤں کی سب لڑکیاں رشک سے دیکھا کرتی تھیں۔ اس کے بھرے گلابی گالوں سے اب ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ اس کی خوبصورت چمکتی بھوری آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں یوں کہ جیسے وہاں گڑھوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہڈیوں پر کھال برائے نام تھی اور لمبے ریشمی بال الجھے سے بکھرے سے تھے اور ان میں چاندی اتر آئی تھی۔

اس کی گلابی ہونٹ اب پپڑی زدہ نظر آتے تھے۔

"چھ سال؟" امل صدمے سے پیچھے کی جانب ڈھے گئی۔

"چھ سال گزر گئے"...... اس کے لیے یقین کرنا بہت تکلیف دہ محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے مرے ہوئے چھ سال گزر گئے یا پھر اپنے جسے کی موت کا انتظار کرتے ہوئے چھ برس بیت گئے؟" اس نے یہ سوال خود سے کیا تھا یا اس لڑکی سے جس کا نام رابعہ تھا، رابعہ یہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"آپ کی لاش تو حویلی کے پچھلے کمرے سے ملی تھی جی۔ مجھے اب ٹھیک سے نہیں یاد لیکن گاؤں میں بھی شور مچا تھا کہ آپ نے خود کو جلا کر خودکشی کر لی ہے۔"

"میری جلی ہوئی لاش؟"

"ہاں جی، میں نے خود دیکھی تھی۔۔۔ سڑ کے سواہ ہوئی پڑی تھی۔" وہ اپنی عمر کے برعکس بہت معصوم تھی اسی لیے ہر چیز کا ذکر بنا سوچے سمجھے کر رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ امل پر اس وقت کیا بیت رہی ہوگی۔

"اور وہ سکینہ کہاں گئی جو اماں رشیداں کی بیٹی تھی۔" ایک وہی تو امل کی ہمدرد تھی، راز دار بھی نگران چھ سالوں میں وہ بھی کبھی اس کی مدد کو نہیں آئی تھی۔

امل نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی تھی کہ اگر اس کے سگے بھائی اس پر رحم نہیں کھاتے تو کوئی اور کیوں اس کی مدد کو وہاں آئے گا۔

"وہ تو اسی دن حویلی سے بھاگ گئی تھی جس دن آپ کی لاش۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ وہ جلی ہوئی لاش ملی تھی جی۔"

"او خدایا"...... اسے اب ہر بات سمجھ آنے لگی تھی۔

سکینہ کبھی وہاں سے نہیں بھاگ سکتی تھی اس بات کا امل کو سو فیصد یقین تھا۔

"وہ لاش سکینہ کی ہوگی۔"

InShOt

"یقیناً اسے جلا کر مار ڈالا گیا ہوگا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ سکینہ کا معصوم سا ہنستا مسکراتا چہرہ اس تاریک کمرے میں ہر طرف نظر آنے لگا تھا۔

"اس کی قبر پر میرے نام کا کتبہ لگا ہوگا۔" امل کو اپنی جان حلق میں اٹکتی محسوس ہوئی تھی۔

"خدا غارت کرے ان درندوں کو۔" آج اتنے سالوں بعد اس کے لبوں سے بددعائیں جاری ہوئی تھیں۔ اس نے انہیں روکنا نہیں چاہا تھا کہ ایسے درندوں کا غرق ہونا ہی بہتر تھا تو پھر چاہے وہ درندے اس کے سگے بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔

☆☆☆

وہ اٹھارہ سالہ لڑکی جس نے اپنا نام رابعہ بتایا تھا، اگلے دن وہ کمرے میں نہیں تھی۔ اسے وہ کریہہ صورت گدھ اٹھا کر لے گئے تھے جن کی آنکھوں میں موجود ہوس سے جانور بھی پناہ مانگتے تھے۔ رابعہ گئی اور پھر دوبارہ کبھی نہ آئی۔

یہ آخری بار تھا جب امل نے وہاں کسی لڑکی کی موجودگی کو اس کمرے میں محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد اس کمرے میں کسی کو بھی نہ لایا گیا مگر چیخوں کی آوازیں ہر رات کہیں نہ کہیں سے سنائی دیتی رہتی تھیں۔

وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی اور ان کی وحشت سے اپنے لرزتے جسم کو پرسکون بنانے کی کوشش کرتی۔

وہ مردوں کے اس معاشرے سے تعلق رکھتی تھی جہاں مرد کے سامنے عورت کا "انکار" برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں بھائی انکار سن کر بہنوں کو اپنی غیرت کی سولی چڑھا دیتے تھے۔ جہاں کم سن لڑکیوں کے منہ سے نکلنے والا انکار ان کی زندگیاں ختم کر دیتا تھا۔ جہاں کئی رابعہ جوانی کو پہنچنے سے پہلے ہی قبروں میں اتار دی جاتی تھیں۔

اس معاشرے میں مرد کو تو انکار کی اجازت ہے مگر عورت کو نہیں۔

مرد انکار کرتا ہے تو اس کی شان بڑھتی ہے۔ عورت انکار کرتی تو اس کی زندگی ختم کر دی جاتی ہے۔

مگر اس دنیا میں جہاں داد جیسے مرد بھی تو پائے جاتے ہیں جو عورت کے انکار کا بھی احترام کرتے ہیں۔

نجانے یہ تربیت کا کھیل ہے یا فطرت کا۔ سب مرد اچھے نہیں ہوتے۔ لیکن سب مرد برے بھی تو نہیں ہوتے...... دنیا میں توازن شاید اسی وجہ سے قائم ہے۔

آج اسے جہاں داد بہت یاد آیا تھا۔ وہ اسے بھولی نہیں تھی مگر اسے یاد کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی۔

زنداں کی سلاخوں کے پیچھے کسی ایسے شخص کی چاہ رکھنا جسے خود ہی اپنے ہاتھوں سے کسی اور کو سونپ دیا ہو، کوئی معنی نہیں رکھتی۔

محبت وہی ہے جس کی بروقت قدر کی جائے۔ بعد میں بے قدری کی دھول اس پر چڑھ جائے تو پھر کوئی جذبہ شفاف نہیں رہتا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ جہاں داد ابھی تک اپنے دل میں محبت کا شفاف جذبہ لیے اسے ڈھونڈ رہا ہوگا یا پھر اس نے بھی محبت پر اسی دن فاتحہ پڑھ لی تھی جب وہ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر آخری بار ملے تھے۔

☆☆☆

شام الم آئی تھی اور آ کر گزر گئی مگر اسے گزرنے میں تیرہ سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ امل نے ان سلاخوں کے پیچھے جانا تھا کہ قید کا ایک لمحہ آزادی کی سو صدیوں کے برابر ہوتا ہے۔ اتنا طویل کہ جوانی بڑھاپے میں ڈھل جائے۔ جیسے اس کی جوانی کو قید کا اژدھا نگل گیا تھا۔

جب وہ یہاں قید میں لائی گئی تھی تب بائیس سال کی تھی اور آج جب اسے ایک دارالامان میں منتقل کیا گیا تو وہ پینتیس سال کی ہو چکی تھی۔ ایک

InShOt

ال نے لمحہ بھر اسے دیکھا اور پلکوں کی لرزش چھپاتی ان کشتیوں کی جانب متوجہ ہو گئی جو صحن کے بیچ ہچکولے کھا رہی تھیں۔ وہ ان موجوں سے لڑ رہی تھیں جو انہیں ڈبو دینے کے قریب تھیں۔

وہ کچھ ثانیے یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر اس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"آپ تو بات کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرتیں۔" اس سے شکوہ کرتے وہ خود ہی مسکرا دیا تھا۔

"یونیورسٹی میں بھی آپ ایسی ہی تھیں۔ میں نے دیکھا تھا آپ کو کئی بار سب سے لاتعلق ہو کر بیٹھے ہوئے۔ مگر واللہ آپ کے ماتھے پر پڑتے غصے بھرے بل ہمیشہ آپ سے بات کرنے کی حوصلہ شکنی کرتے تھے اور میں آپ سے بات کیے بنا ہی واپس چلا جاتا۔" وہ شاید بہت بولنے کا عادی تھا۔ ال آج اس کی حوصلہ شکنی کر کے اسے خاموش نہ کروا سکی کہ اس کا تو اپنا ہی حوصلہ ٹوٹ چکا تھا۔

"آپ بارش کی ہمیشہ سے اتنی ہی دیوانی تھیں یا یہ انکشاف بھی آج ہی مجھ پر ہو رہا ہے؟" وہ اسے مسلسل گرتی بارش کو دیکھتے ہوئے بات بارش کی طرف لے آیا۔ ال اسے نہیں سن رہی تھی۔ اس نے اپنے کان ہمیشہ کے لیے بند کر لیے تھے تاکہ اندر اور باہر کا شور اسے مزید کسی اذیت میں مبتلا نہ کرے۔

"آپ کی ایک دوست بھی ہوتی تھی۔ کیا نام تھا بھلا اس کا؟" وہ ذہن پر زور ڈال کر ال کی دوست کا نام یاد کرنے لگا۔

"ہاں یاد آیا۔ ملیحہ۔ آخری بار مجھے دس گیارہ سال پہلے ملی تھی ایک ریسٹورنٹ میں۔ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی وہاں۔ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ آپ سے تو ملتی ہی رہتی ہوگی۔" اس نے آخر میں خود سے ہی اندازہ لگایا تھا۔

اس کی چمکتی ذہین آنکھیں ال کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظروں کو ال کے چہرے سے ہٹا نہیں پایا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کا لباس پہنے ماتم کی زندہ تصویر نظر آ رہی تھی۔ سیاہ رنگ کے دوپٹے تلے اس کے گہرے سیاہ بال اب سفید رنگ میں ڈھل گئے تھے مگر اسے وہ آج بھی پہلے جیسی دکھائی دے رہی تھی۔

نشیمن کی عورتیں اپنے اپنے کاموں میں مشغول کن انکھیوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ال کے رویے کی عادی ہو چکی تھیں مگر اس کے ساتھ بیٹھے اس شخص کا یہ روپ ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ وہاں آتا تھا تو یوں کسی کے پاس بیٹھ کر اس سے بات نہیں کرتا تھا۔

"یونیورسٹی کے بعد کون کہاں گیا کسی کو نہیں معلوم۔ لیکن آپ مجھے اتنے سالوں بعد مل گئیں۔ کیا یہ ایک حسین اتفاق نہیں؟" وہ اپنی ہر بات کے اختتام پر اس سے سوال کر رہا تھا تاکہ وہ کسی طرح اس کی گفتگو میں شامل ہو سکے یا پھر مڑ کر ایک نظر پھر سے اسے دیکھ سکے۔ لیکن نہ اس نے بات کی اور نہ ہی مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ اٹھ کر برآمدے کے ستون کے پاس چلی آئی۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اب اکا دکا ہی بوندیں گر رہی تھیں۔ دور آسمان پر پر پھیلے ملے سے بادل ہوا کے آگے بے بس پڑتے جنوب کی جانب تیرتے چلے جا رہے تھے۔ نشیمن کے آنگن میں بہتی کشتیاں وہیں ڈوب کر بے معنی ہو گئی تھیں۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔

"کاش! میں بھی اس منظر کا کوئی ادھورا حصہ ہوتا جسے آپ کی ایک نظر مکمل کر دیتی اور میں یوں اس نظر سے محروم ادھورا سا ہو کر واپس نہ پلٹتا۔" وہ اس کے عقب میں کھڑا کچھ پل اس لاتعلق ہوئے وجود کو دیکھتا رہا جس میں حرکت کے نام پر ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی تھی اور پھر قدم پیچھے ہٹاتا وہاں سے چلا گیا۔

جبکہ ال اس آواز کے حصار میں کھڑی کئی گھنٹے

ان دیکھے آنسوؤں کی بارش میں بھیگتی رہی کہ کسی کو روک لینے سے کوئی نا عمر نہیں رکتا۔

ہجر تیرا جے پانی منگے میں کھوہ نیناں دے گیڑاں
دل چاہندا اے تینوں سامنے بٹھا کے درد پرانے چھیڑاں
یار جیہاں دے وچھڑ جاون اوہ کیوں روون تھوڑا
ہر شے نالوں ظالم یارو جس دا نام "وچھوڑا"

☆☆☆

بہار کی یہ دل آویز شام
جس کی طرف
قدم اٹھائے ہیں میں نے
کہ اس سے ہاتھ ملاؤں
اور اک شگفتہ شناسائی کی بنا رکھوں
پھر اپنی خانہ بدوشی کی لے پر
اسے گلاب بکف خیمہ جنوں تک لاؤں
کچھ اس کی خیر خبر پوچھوں
اور کچھ اپنی کہوں
کہوں کہ کتنے ہی پت جھڑ کے موسم آئے گئے
مگر ان آنکھوں کی صحرا البانیاں نہ گئیں
کہوں کہ گرچہ عناصر نے بہتیں باندھیں
جنوں زدوں کی مگر سخت جانیاں نہ گئیں
کہوں کہ ایک ہیں اندیشے سب مرے تیرے
کہوں الگ نہیں جینے کے ڈھب مرے تیرے
کہوں کہ ایک سے ہیں روز و شب مرے تیرے
کہوں کہ ملتے ہیں نام و نسب مرے تیرے

وہ بہار کی ایک خوشبو بھری شام سے پہلے کا وقت تھا جب نشیمن کی عمارت کو پھولوں اور روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ نشیمن کے وسیع آنگن میں بہار کے استقبال کے لیے ایک چھوٹی سی تقریب کا انتظام کیا گیا تھا تا کہ زندگی سے دور یہ بے سہارا عورتیں زندگی کو قریب سے محسوس کر سکیں۔ یہاں ہر خاص و عام دن بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ جس کے لیے کچھ دن پہلے ہی تیاری شروع کر دی جاتی تھی۔

یہاں کی انتظامیہ خواتین میں موقع کی مناسبت سے کپڑے، چوڑیاں اور دیگر چیزیں دو دن پہلے ہی تقسیم کر دیتی تھی۔

امل سمیت اس کے ساتھ بازیاب کروائی گئی عورتوں کو علاج کی بہترین سہولیات مہیا کی جا رہی تھیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا نکھرتا روپ اس بات کی چغلی کھاتا تھا کہ اندر کہیں وہ بھی باقی سب کی طرح جینے کی تھوڑی بہت خواہش رکھتی تھی۔ یا پھر اب یہ خواہش اس کے دل میں پیدا ہونے لگی تھی۔

مگر ایک انجانا سا خوف ہر وقت اسے اپنی لپیٹ میں رکھتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ خوف کس بات کا تھا۔ اس ماضی کا جو وہ سلاخوں کے پیچھے گزار آئی تھی یا پھر اس مستقبل کا جو ابھی آیا ہی نہیں تھا۔

نہیں، یہ خوف تو شاید حال کا تھا کہ جس میں وہ اب کچھ بھی نہیں کھونا چاہتی تھی۔ کچھ بھی نہیں......

وہ ابھی بھی خوف کے سائے تلے ہی کھڑی اسٹیج کے سامنے تھی جسے سفید گلابوں سے سجایا گیا تھا اور ان سفید گلابوں میں کہیں کہیں جامنی رنگ کے پھول بہت خوب صورت دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹیج کے سامنے کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔

بہت سی لڑکیاں ایک دوسرے کو گجرے پہناتے ہوئے قہقہے لگا رہی تھیں۔ کچھ خواتین کے بچے شرارتیں کرتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور وہ ان سے بے خبر بیٹھے ہوئے آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

اس تقریب کے لیے کھانے کا انتظام نشیمن کے عقبی حصے میں کیا جا رہا تھا۔

وہ کچھ دیر خالی نظروں سے وہاں ہوتی ان تیاریوں کو دیکھتی رہی اور پھر جب اکتاہٹ کا شکار ہو گئی تو دالان سے لان کی طرف اترتے اسٹیپس پر

InShOt

جا بیٹھی۔ پاس سے گزرتی ایک کیئر ٹیکر نے دو گجرے اس کی گود میں رکھ کر انہیں پہننے کا کہا۔ وہ کچھ دیر پہلے ایسے ہی گجرے سب میں بانٹ رہی تھی جنہیں ہر لڑکی نے بہت شوق سے پہنے تھے۔

وہ گود میں پڑے ان گجروں کو نرمی سے چھو کر عجب نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے تو ایسے پھولوں کی امید کئی سال پہلے چھوڑ دی تھی اور آج یہ یوں اس کی گود میں پڑے تھے کہ وہ انہیں اٹھا لے اور اپنی کمزور کلائیوں میں پہن لے۔

ان پھولوں کا نرم سا لمس اس کے اندر کسی مرے احساس کو جگانے لگا تھا۔ ایک ایسے احساس کو جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔

اپنے اندر عجیب سی بے چینی کو محسوس کر کے سفید کلیوں اور سرخ گلابوں سے بنے ان گجروں کو اٹھا کر کہیں دور پھینک دینا چاہتی تھی کہ تبھی اس کی وہاں آمد ہوئی تھی۔

سفید شلوار قمیص پر گہرے جامنی رنگ کی برینڈڈ واسکٹ پہنے، بالوں کو سلیقے سے بنائے، چہرے پر دلکش سی مسکراہٹ سجائے وہ اس سے ایک اسٹیپ نیچے بیٹھ گیا۔

وہ ان سالوں میں بہت بدل گیا تھا۔ اس کی چہرے کے نقوش اب سنجیدہ سے نظر آتے تھے مگر اپنی بات کو مسکراہٹ میں لپیٹ کر کہنے کا فن وہ بخوبی جانتا تھا۔

دائیں ہاتھ کی ہتھیلی گال پر رکھ کر، گردن کا زاویہ ذرا سا اس کی جانب موڑ کر وہ اسے دیکھنے لگا جو خود اس وقت سفید رنگ کی شلوار قمیص کے ساتھ گہرے جامنی رنگ کا دوپٹا سر پر اچھے طریقے سے اوڑھے ہوئے تھی۔

اگر یہ اتفاق تھا تو بہت حسین اتفاق تھا۔ اور اگر یہ اس کی شرارت تھی تو بہت خوب صورت تھی۔

اس کے یوں دیکھنے پر ادل نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے رخ دوسری جانب موڑ دیا جہاں کچھ بچے شرارت سے پھولوں کی پتیاں ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے۔ ان کے قہقہے بہار کے ان پھولوں کی طرح شگفتہ سے تھے کہ جن کے بغیر بہار خود کو ادھورا محسوس کرتی تھی۔

وہ اسے کچھ ثانیے یونہی دیکھتا رہا اور پھر اس کی گود میں رکھے گجروں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

آپ انہیں پہن کیوں نہیں رہیں......

اچھے نہیں لگتے؟" اس کے لہجے کی نرمی میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ ادل نے پل بھر کے لیے اس کی جانب دیکھا تھا مگر کوئی بھی جواب دینے سے قاصر رہی تھی۔

"ایسے تو یہ پھول ناراض ہو جائیں گے۔"

وہ ہاتھوں میں پکڑے ان گجروں کو مسل دینے کے قریب تھی مگر اس نے ادل کے اس ارادے کو کامیاب ہونے سے بچا لیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے گجرے لے چکا تھا۔

"لائیں، یہ میں پہنا دیتا ہوں۔"

ادل نے جھجکتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"ہاتھ آگے کریں۔" اب کی بار وہ تحکمانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ ادل نے اپنا ہاتھ بے ساختہ اس کی جانب بڑھا دیا۔

"گڈ گرل۔" وہ مسکرا کر اس کے ہاتھ میں گجرے کا ہک باندھنے لگا۔ ادل کی نظریں اس کے ہاتھ سے پھسل کر اس کے چہرے پر جا ٹھہری تھیں جہاں پھیلی وہ دلکش سی مسکراہٹ ادل کو اپنائیت بھری لگی تھی۔

بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروان تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

وہ اسے یوں گجرے پہنا رہا تھا جیسے اس نے اس لمحے کے لیے صدیوں انتظار کیا تھا۔ آج وہ انتظار پورا ہو گیا ہو جیسے اور ساری محرومیاں اس ایک لمحے میں ختم ہو گئی تھیں۔

وہ اس کے دوسرے ہاتھ میں گجرا پہنا کر ہک بند کر چکا تھا۔ اس عمل کے بعد اس نے ادل کے

InShOt

دونوں ہاتھ نرمی سے واپس اس کی گود میں رکھ دیے تھے۔

سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

ال نے بے یقینی کی سی کیفیت میں اپنے ہاتھوں میں سجے ان گجروں کو دیکھا تھا جن سے پہلی نظر میں اسے وحشت سی ہوئی تھی مگر اب وہی گجرے الفت کے دھاگے معلوم ہو رہے تھے جن سے وہ اس کا دل باندھ چکا تھا۔

اس کی سیاہ گہری آنکھیں کبھی ال کے چہرے پر جا ٹھہرتیں اور کبھی اس کی کلائیوں میں بندھے گجروں پر۔ ال نے ان سیاہ آنکھوں میں لحظہ بھر کے لیے جھانکا تھا اور پھر انہیں مزید نہیں دیکھ پائی تھی۔

سنا ہے اس کی سیہ چشمگی قیامت ہے
سو اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

جادو ان گجروں میں تھا یا پھر انہیں پہنانے والے کے ہاتھوں میں، وہ اندازہ نہیں لگا پائی تھی۔

"ارے یار! تم یہاں ہو۔ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔ مینیجر صاحب بس آنے ہی والے ہیں۔" اس ٹرسٹ کا چیئرمین جسے ذکی، وہاں آنکلا تھا اور اب ال کو نظرانداز کیے خفگی بھرے لہجے میں اسے ڈانٹ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے سرعت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں میں بس آ ہی رہا تھا۔"

"ہاں جلدی پہنچ جانا۔" ذکی موبائل پر کسی کو فون ملاتا وہاں سے چلا گیا۔

وہ دو اسٹیپ اتر کر نیچے چلا آیا اور وہاں جانے سے پہلے اس نے مڑ کر ایک نظر ال کو دیکھا تھا جو اب گجروں سمیت سب کچھ بھول کر صرف اس کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

وہ اسے یوں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر مسکرایا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

نشیمن کی فضا اب اس کے بغیر بوجھل سی لگنے لگی تھی۔ سانس لینے میں دقت پیش آتی تو وہ اس کے انتظار میں باہر چلی آتی۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑی کئی کئی گھنٹے اس کے آنے کا انتظار کرتی۔ دیکھنے والوں کو لگتا کہ جیسے وہ انتظار کی سولی پر لٹک کر پتھرا سی گئی ہے۔ ایک بے جان مورت جو اب بھی پلکیں نہیں جھپکے گی۔ سب جانتے تھے کہ وہ کس کا انتظار کرتی تھی مگر سب نہیں جانتے تھے کہ وہ یہ انتظار کیوں کرتی تھی۔

وہ آج بھی اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی اور انتظار کا یہ سلسلہ پچھلے تین ہفتوں سے چل رہا تھا۔ نجانے وہ کیوں نہیں آ رہا تھا۔ جاتی بہار کی شام افسردہ سی محسوس ہو رہی تھی۔

جے ایتھوں کدی راوی لنگ جاوے

دور چبوترے پر چند عورتیں بیٹھے ہوئے سُر اور تال کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ کسی عورت کی درد بھری آواز اس کی اداسی کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ بانسری کے چھلنی ہوئے وجود سے درد بھری لے کیسے نکلتی ہے۔

جے راوی وچ پانی کوئی نئیں
تے اپنی کہانی کوئی نئیں
جے سنگ بیلی یار کوئی نہ
تے کسے نوں سنانی کوئی نئیں

درد بھری اس لے نے پتھرائی ہوئی مورت کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے تھے اور وہ ہچکیاں لیتی رو دی تھی۔

اکھاں چ دریا کول کے
میں زخماں دی تھاں تے روڑ لاں
جے ایتھوں کدی راوی لنگ جاوے

گزرے چودہ سالوں کے ان گنت شب و روز اس کی آنکھوں کے سامنے پھر سے منڈلانے لگے تھے اور اس کے لیے سب سے تکلیف دہ لمحے وہ تھے جن کے بعد اسے لگا تھا کہ وہ مر جائے گی۔

InShOt

ایک وہ لمحہ جس میں اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے جہاں داد کی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ دوبارہ سانس نہیں لے پائے گی۔ وہیں دم توڑ دے گی۔ وہیں کہیں اسکول آف ایوی ایشن کی کسی سیڑھی پر۔

اور ایک وہ لمحہ جب اس کے ابا جی اسے اس کے بھائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کہیں دور چلے گئے تھے۔ اتنی دور کہ وہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ مر گئی تھی۔ مگر وہ تو زندہ تھی۔ اسے تو ابھی اور بھی بہت کچھ جھیلنا تھا۔ ایک ایسی سزا جو ایسے جرم میں ملی تھی جو اس سے سرزد بھی نہیں ہوا تھا۔ تیرہ سال اور ان تیرہ سال کے کئی لمحے...... اتنے لمحے کہ وہ گننے بیٹھتی تو شاید ختم ہی نہ ہوتے۔ جتنے لمحے، اتنی ہی اذیتیں۔ تو چاہے پھر وہ لمحے شمار کر لے یا پھر ان اذیتوں کو گن لے جنہیں جھیلنے کے بعد اس نے ہمیشہ اپنے مرنے کی دعا کی تھی۔

وہ کوٹھری، جس میں اس کے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن اس قدر بڑھ گئے تھے کہ اہل کو خود ہی ان سے گھن آنے لگی تھی، وہ اب بھی اسے کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ لگتی تھی۔ وہ جو کبھی خود پر ذرا سی مٹی نہیں لگنے دیتی تھی اور وہاں مٹی میں مٹی ہو گئی تھی۔

اے کیسی مجبوری ہو گئی
کہ سجناں توں دوری ہو گئی
تے ویلیاں دے نال وگدی
اے جند کدوں پوری ہو گئی

اس نے اپنی زندگی کو گزارا نہیں تھا بلکہ زندگی اسے گزار کر پوری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جو آسمانوں پہ اڑنا چاہتی تھی، اڑنے سے پہلے ہی قفس میں ڈال دی گئی تھی۔ وہ پائلٹ بننا چاہتی تھی، ہواؤں میں لمبی پروازیں بھرنا چاہتی تھی مگر وہ وہاں بیٹھی تھی، جہاں آنے کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک ٹرسٹ میں جو صرف لاوارث خواتین کے لیے تھا۔ جس دن اس کے ابا جی کا انتقال ہو گیا تھا، اس دن وہ بھی لاوارث ہو گئی تھی۔

اسے یاد تھا کہ جب کبھی وہ بادشاہوں کی کہانیاں پڑھتی تھی تو اکثر سوچ کر رہ جاتی کہ تخت کے لیے کوئی باپ اپنے بیٹے کو کیسے قتل کر سکتا ہے؟ کوئی بیٹا اتنا سخت دل کیسے ہو سکتا ہے کہ سوتے میں اپنے باپ کا سر اس کے تن سے جدا کر دے؟ وہ بھی صرف سلطنت کے ایک تخت کے لیے؟ آخر نوشیروان کا پوتا اپنے باپ ہرمز کا قتل ساسانی تخت کے حصول کے لیے اتنی بے رحمی سے کیسے کر سکتا ہے؟

اور وہ بھی جب اس نے ایک خبر سنی تھی جس میں جائیداد کی خاطر بھائیوں نے اپنی بہن کو بیس سال ایک کمرے میں بند رکھا۔ جہاں اسے ٹی وی چینل والوں نے پولیس کے ساتھ مل کر بازیاب کروایا۔ وہ پچیس سال کی عمر میں قید کی گئی اور پینتالیس سال کی عمر میں آزاد کروائی گئی۔ اس کی وڈیو دیکھ کر اہل رو ہی تو پڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بھائی اتنے سنگدل

نہیں ہو سکتے کہ اپنی بہن کو ایسے کمرے میں ایک چھوٹی سی جائیداد حاصل کرنے کے لیے ڈال دیں جہاں روشنی بھی نہیں جاتی تھی۔ جہاں وہ کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جہاں وہ کھانا اس کے سامنے پھینک آتے تھے، یہ جانے بغیر کہ وہ زندہ بھی تھی یا مر گئی۔ اسے جب نکالا گیا تو وہ پاگل ہو گئی تھی۔

اہل نہیں جانتی تھی کہ قدرت اس کے سوالوں کا جواب اسے یوں عملی طور پر دے گی۔ اس کے بھائیوں نے بتا دیا تھا کہ تخت و تاج کے آگے ہر رشتہ بے معنی ہوتا ہے۔

بیگانیاں دی را چھوڑ کے
میں اپنی موہار موڑ لاں
جے ایتھوں کدی راوی لنگ جاوے
حیاتی بیچ آبی بن جاوے
میں بیڑیاں ہزار توڑ لاں
میں پانی وچوں سا نچوڑ لاں
جے ایتھوں کدی......

درد بھری آواز مدھم ہوتی ہوتی غروب ہوتے سورج کی طرح کہیں ڈوب گئی تھی۔ دن کے اجالے کو رات کا اندھیرا نگلنے کے لیے زمین پر اپنا پڑاؤ ڈال چکا تھا بالکل ویسا ہی اندھیرا جو کوٹھری کے بند کمرے میں ہر وقت رہتا تھا۔ ال کو نگلنے کی تاک میں......

☆☆☆

اب کی بار جب وہ آیا تو ال اسے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ملی تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں اس وقت انیس بیس سالہ چار لڑکیاں دیوار میں نصب ایل سی ڈی پر اپنا پسندیدہ ڈرامہ بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھیں اور ال ان سب سے الگ ایک کونے میں بیٹھی کسی میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔

"آپ کوئی ایکٹیویٹی نہیں کرتیں؟" وہ ایک چھوٹا سا اسٹول کھینچ کر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔

ال نے توقع کے عین مطابق سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پیچھے کی جانب سرک گئے دوپٹے کو دوبارہ سے سر پر ٹکایا تھا۔

وہ اپنے مخصوص حلیے میں ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا یا پھر وہ اسے دیکھ کر ایسا ہو جاتا تھا۔

ال نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اپنی توجہ دوبارہ میگزین کی جانب مبذول کر لی۔

"یہ دیکھیے، میں آج آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔" اس نے اپنے ہاتھ میں البم کی طرف اشارہ کیا جس کی سیاہ جلد اب پھیکی پڑ چکی تھی مگر اس پر لکھے گئے الفاظ "ڈی پرلز" گولڈن کلر میں واضح دکھائی دے رہے تھے۔

"ایک البم...... جس میں نظر آنے والے چہرے کہیں کھو گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے البم کھولنے لگا۔

ال بے ساختہ اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی اور اب البم کے کھلے پنے دیکھ رہی تھی جن میں کئی ایسے چہرے تھے جنہیں وہ یونیورسٹی کے تین سالوں میں دیکھ چکی تھی اور کچھ ایسے تھے جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔

"یہ ملیحہ ہے...... آپ کی سب سے اچھی دوست، بلکہ آپ کی اکلوتی دوست۔ یونیورسٹی میں آپ کو جب بھی دیکھا، اس کے ساتھ ہی دیکھا۔ خوش قسمت تھی وہ...... خیر۔" وہ دنیا بھر کی مٹھاس اپنے لہجے میں لیے اسے البم میں موجود ہر شخص کے بارے میں بتا رہا تھا۔

ال نے ملیحہ کے چہرے کو دیکھا تھا اور یونیورسٹی کے تین سالوں میں ہر وہ لمحہ جو وہ اس کے ساتھ گزار چکی تھی، اب یاد آنے لگا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی مگر اسے یاد تھا کہ جب وہ ہاسٹل کے کوریڈور سے گھر کے لیے نکلی تھی تو ملیحہ اسے نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس نے اس کے بعد ایک بار بھی ال کو فون نہیں کیا تھا۔ یہ پوچھنے کے لیے بھی نہیں کہ اس پر ان دنوں کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی بلکہ کون کون سی قیامتیں ٹوٹ پڑی تھیں۔

وہ اس کی دوست تھی، ایسا اس کا خیال تھا۔ وہ اس کی دوست نہیں تھی، یہ اسے یقین ہو گیا تھا۔

ملیحہ سے جڑی اچھی بری یادیں اس کی چہرے پر درد بھرے تاثرات لے آئی تھیں جو سامنے بیٹھے شخص سے بالکل بھی مخفی نہیں تھے۔

"اور بھلا یہ کون ہے؟" اس نے البم ذرا سی سرکا کر اس کے سامنے کی تو وہ یک ٹک سی اس تصویر کو دیکھنے لگی۔

تصویر میں ایک لڑکی ملیحہ کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ بالکل وہی یونی فارم پہنے جو البم میں نظر آنے والے بیشتر لوگوں نے پہن رکھا تھا۔ اسکول آف ایوی ایشن یونی فارم جسے وہ بہت فخر سے پہنا کرتی تھی۔ جسے پہن کر اس نے خود کو خوابوں میں اڑتے دیکھا تھا اور جسے پہن کر وہ کسی کے ساتھ حقیقت میں اڑنا چاہتی تھی۔

وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ کم از کم اسے تو

InShOt

پہلی نظر میں ایسی ہی لگی تھی۔ ابل نے اس کے معصومیت سے بھرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ شاید وہ اسے پہچان بھی گئی تھی مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے خیال کی نفی کی تھی۔

"یہ ابل ہے...... یعنی آپ۔" وہ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

ایک ہوک سی ابل کو اپنے اندر سے اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کیا تھی اور اب کیا ہو گئی تھی۔ کاش ماضی مٹ جاتا اور جو ہوتا وہ صرف "حال" رہتا۔ اس نے البم کا صفحہ بدل دیا تھا۔

"اور یہ دیوانہ شخص اس کہانی کا رومیو ہے جس کی جولیٹ چودہ برس پہلے اس سے بچھڑ گئی تھی۔" وہ مسکرایا تو آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گر پڑا۔

"جہاں داد...... یعنی میں۔"

ابل کو اپنا جسم لرزتا محسوس ہوا تھا۔

اجنبیت کی جو دیوار اس نے اپنے گرد بنائی تھی وہ اس تعارف کے بعد ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا حال اور ماضی پھر سے ایک ہو گئے تھے۔ یوں جیسے یہ چودہ برس کی نہیں بلکہ چودہ سیکنڈز کی بات ہو۔ اور یوں کہ جیسے وہ کبھی بچھڑے ہی نہ ہوں۔ آج بھی وہیں بیٹھے ہوں...... ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پہ۔ ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے...... ہنستے ہوئے اور اگلے ہی لمحے اداس ہوتے ہوئے۔

وہ چودہ سال کی مسافت کے اس پار کھڑی تھی جہاں سے جہاں داد تک کی رسائی ناممکن تھی مگر اس تعارف نے لمحوں میں ہر مسافت کو طے کر دیا تھا۔

وہ اسے پہلے دن ہی پہچان گئی تھی بلکہ اس کی آواز تو وہ کبھی بھول ہی نہیں پائی تھی مگر اس نے اپنی آنکھوں میں در آئی شناسائی کی چمک کو بیگانگی سے چھپا لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جہاں داد اسے اس حال میں پہچانے کہ جس میں خود کو بھی پہچان نہیں پا رہی تھی۔ لیکن محبت میں کسی کو پہچاننے کے لیے حال وحلیے معانی ہی کب رکھتے ہیں۔

جہاں داد نے بھی اسے پہچان لیا تھا اور یوں چودہ سال بعد رومیو کو اس کی جولیٹ پھر سے مل گئی تھی مگر ملن ممکن ہو گا یا نہیں، یہ کون جانے۔

☆☆☆

وہ اس کے سامنے بیٹھی سوں سوں کرتی رو رہی تھی اور وہ پچھلے پندرہ منٹ سے اسے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے دیکھ رہا تھا۔

"ہا!!!!!۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں لڑکی؟" وہ اس کے یوں رونے سے پریشان ہو رہا تھا۔

"لڑکی نہیں رہی اب میں"...... وہ اسے ٹوکنے کے بعد پھر سے اونچی آواز میں رونے لگی۔

"کیوں اب تمہارے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟" وہ نہایت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"وہ تو مجھے آپ کے سر پر نظر آ رہے ہیں۔" ابل کے منہ سے یہ الفاظ بے ساختہ نکلے تھے۔ جہاں داد نے خفگی سے اسے دیکھا تو وہ جھینپ سی گئی۔

"شکر ہے تمہاری آواز تو سنی۔ چودہ سال سے میری سماعتیں یہ فاقے کاٹ رہی تھیں۔ اب یوں لگتا ہے کہ سماعتوں کے ساتھ ساتھ ان آنکھوں کو بھی ان کا رزق مل گیا ہے اور یہ پھر سے جی اٹھی ہیں۔" اس کی سیاہ چمکتی آنکھیں ابل کے چہرے پر جمی اپنی ہی بات کہے جا رہی تھیں۔

"ملیحہ کو کیوں نہیں لاتے آپ اپنے ساتھ؟" وہ ان نگاہوں کی حدت سے مزید پگھلنا نہیں چاہتی تھی اس لیے گفتگو کا موضوع بدلنے لگی۔

"کہاں سے لاؤں اسے میں اپنے ساتھ؟" وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا آیا جو کچن کے عقبی حصے کی جانب کھلتی تھی جہاں لگے پودوں پر کھلے پھول موسم بہار سے لطف اٹھا رہے تھے۔

"اپنے گھر سے بھئی۔" وہ رونا بھول کر جہاں داد کی کم عقلی پر افسوس کرنے لگی۔

"میرے گھر میں نہیں ہے وہ۔"

"کیوں؟"

InShOt

"ارے! بتایا تو تھا اس دن یا وہ بات بھی تم نے مذاق میں لے لی تھی؟"

"کون سی بات؟"

"وہی کہ یا وہ سال پہلے اس نے کسی اور کے ساتھ شادی کرلی تھی اور وہ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں ملی تھی۔ تمہیں پتا ہے ال وہ بس مجھے تم سے چھیننا چاہتی تھی۔ میں اس کے لیے ایک ایسی ضد تھا جس میں ہارنا اسے کسی صورت بھی منظور نہیں تھا۔ تم سے چھین لینے کے بعد اس کی ضد ختم ہوگئی تھی اور یوں وہ رشتہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ تمہاری بھی دوست نہیں رہی تھی ال۔" وہ کھڑکی کے سامنے منڈلاتی تتلیوں کو بہت افسردگی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ ایسی ہی افسردگی ال کی آنکھوں میں بھی تھی بلکہ افسردگی سے زیادہ شرمندگی تھی کہ اس نے کس دعوے کے ساتھ جہاں داد کو کہا تھا کہ ملیحہ اس سے بہت محبت کرتی ہے اور وہ اسے چھوڑ کر ملیحہ سے شادی کرلے۔

"پھر؟" وہ اپنی شرمندگی پر جلد سے جلد قابو پانا چاہتی تھی۔

"پھر وہ آسٹریلیا چلی گئی۔"

"اور اس کے بعد؟"

"اس کے بعد؟ یہ تو رائٹر نے مجھے بھی نہیں بتایا۔" جہاں داد نے پلٹ کر اس کی طرف شرارت سے دیکھا تو وہ اپنے غصے پر ضبط کرتی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے بگڑے تاثرات دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

اس کا روٹھنا اور ماننا۔ جہاں داد کے لیے اس سے بڑھ کر کچھ بھی خوب صورت نہیں تھا۔

"اور آپ کے بیوی بچے؟" ال کو اچانک خیال آیا تھا۔

"ہاں، ہاں، پوچھ لو...... سب کے بارے میں پوچھ لو۔ بس میرے بارے میں نہ کچھ پوچھنا کہ میں کہاں تھا؟ کیسا تھا اور اب کیسا ہوں۔ بھلا پوچھو گی بھی کیوں۔ تمہیں نہ کبھی فرق پڑا تھا اور نہ ہی اب پڑے گا۔" وہ یوں بول رہا تھا جیسے کوئی بچہ روٹھ رہا ہو۔ ال یک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ رخ موڑ کر دوبارہ ان تتلیوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو کہیں سے اڑتی چلی آئی تھیں اور اگلے ہی لمحے کہیں غائب ہو جاتی تھیں۔

"اس میں اتنا خفا ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ ہی کے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" وہ میگزین وہیں رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور اب اس سے ہی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

"اچھا، مگر پوچھ کس بیوی کے بارے میں رہی ہو؟ پہلی؟ دوسری یا تیسری کے بارے میں؟" وہ کھڑکی کے پٹ سے بازو ٹکا کر کھڑا، اس کی طرف رخ موڑے نہایت سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"اللہ! کتنی شادیاں کی ہیں آپ نے؟" وہ منہ کھولے اپنی حیرت کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکی۔

"گن لینے دو"...... وہ انگلیوں کی پوروں پر کوئی حساب کتاب کرنے لگا۔ ال چہرے پر جیلسی اور حیرت کے تاثرات لیے اسے یوں کرتے خفا نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"دو سال پہلے والی ملا کر کل تین۔" وہ اپنی بیویوں کی تعداد گن چکا تھا۔ "مگر فکر نہ کرو۔ چوتھی کی گنجائش ہے ابھی۔"

"ابھی چوتھی کا بھی ارادہ ہے؟" ال نے ایک ایک لفظ چبا کر پوچھا تھا۔

"بالکل، خدا مجھے وہ وقت جلد دکھائے۔" وہ اسے جیلس کرنے کے فل موڈ میں تھا۔ اس لیے ال کی اس کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"بلکہ میں نے تو چوتھی ڈھونڈ بھی لی ہے۔" اس کی سیاہ آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ "پوچھو گی نہیں کہ کون ہے وہ؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے پوچھنے کی۔" وہ کندھے اچکاتی وہاں سے ہٹ گئی۔

"پوچھ لو، ورنہ رات کو تمہیں نیند نہیں آئے گی۔" وہ بھی قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چلنے لگا۔

InShOt

"مجھے اب ویسے بھی نیند نہیں آتی۔" وہ ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل آئی تھی اور اب بہت تیز چل رہی تھی۔

"مگر کیا پتا اس سوال کے بعد تمہیں آجائے نیند۔" وہ اس سے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں اب راتوں کو سونے سے ڈرتی ہوں جہاں داد۔" وہ رکی تھی اور رک کر اس کی جانب پلٹی تھی۔

اس کے یوں رکنے سے وہ بھی رک گیا تھا۔

"مجھے میرا ماضی خوابوں کا روپ دھار کر ڈراتا ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر اس کے گالوں پر پھسل رہے تھے۔ جہاں داد کی آنکھوں میں بے بسی ہی بے بسی تھی۔ کاش وہ اس کے یہ سارے آنسو چن سکتا۔

"میں اب بھی سونا نہیں چاہتی...... کبھی بھی نہیں۔" وہ سرنفی میں بار بار ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔ جہاں داد نے اس کے پیچھے جانا چاہا مگر نجانے کیا سوچ کر وہیں سے واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

وہ اسے بول کر آیا تھا کہ وہ ساری رات سو نہیں پائے گی مگر وہ خود ابھی تک سو نہیں پایا تھا۔ گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی اور نیند تھی کہ آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرتا تو امل کی وہ آنکھیں سامنے آجاتیں جن میں بے بسی اور خوف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

اسے یاد تھا کہ جب امل کئی دن یونیورسٹی نہیں آئی تھی تو وہ اس کے گھر پہنچ گیا تھا جہاں سے اس کے بھائیوں نے اسے ڈرا دھمکا کر وہاں سے جانے کا کہہ دیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ جب وہ دوسری بار اس کی خیریت دریافت کرنے گیا تو اسے وہاں امل کے مرنے کی خبر دے دی گئی تھی جسے سن کر وہ کئی ماہ گہرے صدمے میں رہا تھا۔ امل کی موت کی خبر پر یقین کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ بے شک وہ اس قبر پر فاتحہ بھی پڑھنے گیا تھا، جس پر امل کے نام کا کتبہ لگا تھا مگر پھر بھی اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس مٹی کے ڈھیر کے نیچے اس کی امل نہیں تھی۔

وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کر بالکونی میں چلا آیا جہاں شہر لاہور سکون کی چادر اوڑھے خاموش سا نظر آرہا تھا۔ دور کہیں چاند بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی میں مصروف تھا۔ جہاں داد نے ایک گہری سانس افسردہ سی فضا میں خارج کی اور اس دن کو یاد کرنے لگا جب وہ اسے نشیمن کے لان میں گم صم سی بیٹھی دکھائی دی تھی۔

نشیمن ٹرسٹ کی بنیاد جہاں داد نے ہی اپنے دوست ذکی کے ساتھ مل کر رکھی تھی جسے بنانے کا مقصد لاوارث خواتین کو چھت سمیت زندگی کی بنیادی چیزیں فراہم کرنا تھا۔ جہاں داد چونکہ زیادہ تر اپنی جاب پر ہوتا تھا اس لیے مہینے میں صرف ایک یا دو بار ہی نشیمن کا چکر لگا پاتا تھا۔ اس دن بھی وہ تقریباً پندرہ بیس دن بعد نشیمن آیا تھا جب لان سے گزرتے ہوئے اس کی نظر امل پر پڑی تھی۔ پہلے پہل یہ اسے اپنا وہم لگا تھا اور وہ اس کے قریب سے گزر کر ذکی کے آفس کی جانب بڑھ گیا لیکن وہ خود کو وہاں کافی دیر روک نہیں پایا تھا اور واپس اسی جگہ پر آگیا جہاں وہ بیٹھی کیاریوں میں لگے پودوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

جہاں داد نے جھک کر اس ویران سے چہرے سے اس چہرے کو ڈھونڈنا چاہا جو اس کی امل کا تھا۔ امل نے اس کی جانب نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کی آمد سے بے خبر رہی۔ اسے وہ عورت بالکل امل جیسی لگ رہی تھی۔

اس امل جیسی جس کی قبر پر وہ کئی سال پہلے فاتحہ پڑھ کر آیا تھا۔ تو پھر وہ اتنے سالوں بعد اچانک کیسے زندہ ہو سکتی تھی۔ وہ سرنفی میں ہلاتا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اسے اس مرجھائے چہرے میں امل کی ہی

InShOt

شبیہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا دماغ کئی دلیلیں دے رہا تھا اور اس کا دل ہر دلیل کو رد کر رہا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ دل کی سنے یا پھر دماغ کی۔ اس بات پر یقین کرے کہ امل تو کئی سال پہلے مر چکی ہے یا پھر اس بات پر کہ وہ ابھی بھی اس کے سامنے بیٹھی ہے۔

"اوہو! تمہیں کیا ہو گیا ہے جہاں داد۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ اپنے ہر خیال کی نفی کر کے دوبارہ ذکی کے دفتر میں چلا آیا۔

"یہ کون سی بے چینی تمہیں ٹک کر بیٹھنے نہیں دے رہی؟" ذکی نے کیلکولیٹر پر کوئی حساب کتاب کیا تھا جسے وہ اب اپنے سامنے کھلے ایک رجسٹر میں درج کر رہا تھا۔

"یار ذکی؟" وہ اس کے سامنے والی کرسی ذرا سی آگے کر کے بیٹھ گیا۔

"ہاں بولو۔" ذکی نے رقم ایک خانے میں درج کر دی تھی۔

"کوئی مر کر دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے؟" میز کے کھردرے کنارے کو انگوٹھے کے ناخن سے کھرچتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔

"ہر انسان دوسری بار زندہ ہو گا۔" وہ اس کے سوال کو مذاق میں اڑا گیا تھا۔

"فضول مت بولو۔"

"اصل بات تو بتاؤ۔" ذکی نے رجسٹر بند کر دیا تھا اور اب پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔

"اصل بات چھوڑو، یہ بتاؤ کہ باہر وہ خاتون کہاں سے آئی ہے؟"

"کون سی خاتون؟"

"لان میں بیٹھی ہے۔ کیاری کے پاس۔" ذکی فوراً سے پہلے اٹھ کر آفس سے نکل گیا تھا اور کچھ ہی دیر بعد واپس آ گیا تھا۔

"اچھا وہ عورت؟ آہ! کچھ نہ پوچھو اس کے بارے میں۔ اس کی کہانی سن کر تو کوئی سنگدل بھی رو سکتا ہے۔ بہت ظلم ہوا ہے اس بے چاری پر۔" اپنی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے وہ بولا تھا۔

"کیوں؟ ایسا کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟" جہاں داد کا دل نجانے کیوں بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ذکی کی تصدیق سے پہلے وہ اپنے ہر وہم کو نظر انداز کر دینا چاہتا تھا مگر وہ ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔

"یہ وہی عورت ہے جسے بسم اللہ پور نامی گاؤں سے بازیاب کروایا گیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے جائیداد کی خاطر اسے گاؤں کے قریب ہی ایک خالی گھر میں قید کر دیا تھا۔ اور گاؤں میں اس کی خودکشی کی خبر پھیلا دی تھی۔ پولیس آپریشن کے بعد ساری بات میں نے تمہیں بتائی تو تھی کہ وہاں اس خاتون سمیت کچھ اور خواتین کو بھی گاؤں کے وڈیروں سے آزاد کروایا گیا تھا۔ امل نام ہے شاید اور......." اس سے آگے جہاں داد کچھ سن نہیں پایا تھا اور سرعت سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ باقی کی کہانی وہ ذکی سے پہلے ہی سن چکا تھا مگر تب وہ نہیں جانتا تھا کہ جس خاتون کے بارے میں وہ اسے بتا رہا تھا وہ امل ہی تھی۔ تب ذکی بھی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ گاؤں میں ادھر ادھر سے پتا کرنے پر ہی اسے امل کے بارے میں تھوڑا بہت پتا چلا تھا۔

امل کا نام سن کر اسے لگا تھا کہ کسی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا اسی لیے دوبارہ کرسی پر ڈھے سا گیا۔

"کیا ہوا جہاں داد؟ تم ٹھیک تو ہو؟" ذکی سرعت سے اس کی جانب لپکا تھا۔

جہاں داد نے دھیرے سے ہاں میں سر ہلا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ امل ہی تھی۔ جس کی یادوں کے سہارے اس نے اپنی زندگی کے چودہ سال گزار دیے تھے۔

جہاں داد نے رات کی تاریکی میں کچھ ٹٹولنا چاہا تھا مگر ناکام سا واپس اپنے کمرے میں پلٹ گیا جہاں اسے نیند ہرگز نہیں آنے والی تھی۔

☆☆☆

InShOt

کچھ روز پہلے عدالت اس کے دونوں بھائیوں کو عمر قید کی سزا سنا چکی تھی۔ فیصلے سے پہلے ہونے والی پیشی میں گواہی کے طور پر نیشمن کا وکیل چاہتا تھا کہ ایل بھی جائے مگر اس نے خود کو کسی بھی گواہ، کسی بھی وکٹم کے طور پر پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا سامنا اس کے ان بھائیوں سے ہو جنہوں نے اس کے ساتھ اس قدر ظلم کیا تھا کہ آج بھی سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

ایل ان کا سامنا کر کے خود کو دوبارہ اس اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی جسے وہ کئی سال جھیل چکی تھی۔

اس نے اپنا معاملہ رب کے سپرد کر دیا تھا۔ بے شک اس کے بھائیوں کو اس دنیا میں سزا مل چکی تھی مگر یہ سزا بہت کم تھی۔ اس نے کئی عورتوں کو اپنے سامنے درد سے کراہتے دیکھا تھا۔ اذیت سے مرتے دیکھا تھا۔ اس کے بھائیوں کو بھی اتنی ہی تکلیف ملنی چاہیے تھی جو اس سمیت ان سب عورتوں نے جھیلی تھی۔ اور دنیاوی عدالت یہ حساب کبھی بھی برابر نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے وہ ان دونوں کی سزا اپنے رب کے سپرد کر چکی تھی کہ بے شک وہی بہترین بدلہ لینے والا ہے۔

☆☆☆

"ارے آپ یہاں بیٹھی ہیں؟ باہر سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" کیئر ٹیکر اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئی تھی جہاں وہ سر جھکائے کسی کتاب کے مطالعے میں معروف تھی۔ کیئر ٹیکر سدرہ کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اپنا سانس درست کرتی اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے اسے کسی بات کی بہت جلدی ہو۔

"کیوں؟" وہ یہ سوال پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"باہر تو چلیں۔" سدرہ نے اس سے کتاب لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے سے باہر لے آئی۔

نیشمن کے کوریڈور سے گزرتے ہوئے گھنٹیوں کی مدھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی مگر وہ ان آوازوں کو نظرانداز کرتی سدرہ کی پیروی میں چلتی ہوئی باہر لان تک آ گئی تھی جہاں بچھی کرسیوں پر نیشمن کی خواتین بیٹھے ہوئے اس کی منتظر نظر آ رہی تھیں۔

ایل نے سرسری سی نظر ان سب پر ڈالی تھی۔ وہ سب گردن پیچھے کی طرف موڑے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ وہ پل بھر میں حیران ہوئی تھی اور دوپٹا سر پر ٹھیک کرتی کچھ قدم آگے بڑھ آئی تھی۔

کرسیوں کے سامنے صوفے بچھائے گئے تھے اور وہاں جہاں داد بیٹھا کسی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایل کو اپنے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سر جھکا کر پچھلی قطار میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ وہ اس سے چھپ رہی تھی اور جہاں داد یہ جان چکا تھا۔ اور یہ جان لینے کے بعد وہ مسکرائے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

ایل نے وہیں بیٹھے اردگرد کا جائزہ لیا تھا اور وہاں سب کچھ خلاف معمول نظر آ رہا تھا۔

درختوں کی شاخوں سے بندھی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں اپنی من کی کہتے ہوئے شور مچا رہی تھیں۔ چھوٹے پودوں کے گرد لپٹے برقی قمقمے جگنوؤں کی مانند جگمگ کرتے ماحول کو خوب صورت بنا رہے تھے۔ نیشمن کے آنگن میں اترتی شام اپنے حسین ہونے پر نازاں نظر آ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ حسین شاموں میں سے ایک شام تھی جو اپنے سحر میں جکڑ لینے کے لیے کافی تھی۔

"ادھر کیوں بیٹھ گئی ہیں آپ؟" سدرہ نے اسے وہاں سے اٹھنے کا کہا تھا۔ وہ اس کے اشارے پر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اٹھ گئی تھی اور اب اس سے ایک قدم پیچھے چلنے لگی تھی۔ وہ اسے ان صوفوں کے قریب لے آئی تھی جہاں وہ بیٹھا تھا اور اب اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

سیاہ سوٹ کے ساتھ سفید شرٹ پہنے وہ طلسمی

InShot

دنیا کا ایک ایسا باشندہ نظر آرہا تھا جس کی جادوئی مسکراہٹ کے آگے شہزادی وقت اپنا دل ہار بیٹھتی ہے۔ وقت کی یہ شہزادی امل تھی جو ایک بار پھر اس کے لیے اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کتنی دیر پلکیں جھپکے بنا اسے دیکھے گئی تھی۔ اگر وہ اسے نہ پکارتا تو شاید وہ اسے دیکھنے میں رات سے صبح کر دیتی۔

"امل!" جادوئی زندان کے اُس پار جہاں داد کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ ہوش کی دنیا میں چونک کر لوٹ آئی تھی۔

"یہ میری امی ہیں اور یہ آج خاص طور پر تم سے ملنے آئی ہیں۔" اس کا اشارہ اس نفیس سی خاتون کی طرف تھا جو جہاں داد کے برابر میں بیٹھی تھیں اور اب شفیق سی نظروں سے امل کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔" وہ ان کے قریب ہوگئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" لبنیٰ بیگم نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے اسے گلے سے لگایا تھا۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پہنے، ڈائی کیے بالوں کا جوڑا بنائے اپنی عمر سے بہت کم دکھائی دے رہی تھیں۔

"ادھر آؤ، یہاں بیٹھو میرے پاس۔" امل کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اسے اپنے برابر میں ہی بٹھا لیا۔

امل نے سوالیہ نظروں سے جہاں داد کی طرف دیکھا تو اس نے کندھے اچکاتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔ بائیں صوفے پر بیٹھا ذکی اور سامنے بیٹھی سب خواتین اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے وہ پہلے سے ہی جانتی تھیں کہ حسین شام کا یہ اہتمام کس لیے تھا۔ امل ان نظروں سے کوئی خاص اندازہ نہیں لگا پائی تھی، اسی لیے دوبارہ سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

لبنیٰ بیگم اس کا ہاتھ نرمی سے تھامے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں تو جہاں داد کی بے صبری اس کے چہرے سے نمایاں ہونے لگی۔ لان میں سب کی "ممی ممی" ایک ساتھ فضا میں ابھری۔

"امی! یہ ساری باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔" وہ بے صبری میں ان کی طرف آگیا تھا۔

"ہاں تو؟" لبنیٰ بیگم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"تو آپ وہ بات کریں جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔" اس نے اصل مدعا کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ بات تو تم کرو گے ناں بیٹا۔"

"میں؟ مگر میں کیوں؟" وہ اردگرد دیکھتے ہوئے سٹپٹا سا گیا۔

"ممی ممی" کی آوازیں ایک بار پھر آئی تھیں۔

"کیونکہ ہم سب تو لڑکی والے ہیں ناں۔ میں امل کی ماں ہوں۔ ذکی اس کا بھائی اور یہ سب اس کی بہنیں۔ اس لیے جو بھی بات ہے وہ تم خود کرو گے ہم سے آکر۔" وہ اسے سب سمجھا چکی تھیں۔

بات کچھ حد تک امل کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ اس کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی۔ اس لیے وہاں سے بھاگنے کے بہانے سوچنے لگی۔

"ذکی! ایسا کہاں ہوتا ہے یار؟" ذکی کی طرف دیکھ کر اس نے تقریباً احتجاج ہی تو کیا تھا۔

"یہاں تو ایسا ہی ہوگا۔" ذکی کی طرف سے دو ٹوک جواب تھا جس نے اسے سر پیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ پہلے ہی بہت حد تک نروس تھا اور اب سب کے سامنے خود سے ساری بات کرنے کا سوچ کر وہ اور بھی نروس ہونے لگا تھا۔

"یہ سین ریورس ہوگا۔ تم دوبارہ آؤ گے اور آکر ہم سے ہماری بہن کا ہاتھ مانگو گے۔" ذکی نے اسے وہاں سے جانے کا بول دیا تھا۔ وہ اسے غصیلی نظروں سے دیکھتا وہاں سے چلا گیا تا کہ منظر کی شروعات ویسے ہی کر سکے جیسا اسے شروع ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

منظر وہی تھا، وہی چہرے، وہی نظریں، وہی

گھنٹیوں کی مدہوش کرتی آوازیں، وہی جگمگاتے ننھے جگنو، وہی حسین شام۔ سب کچھ وہی تھا مگر منظر کا آغاز اب کی بار ایک نئے انداز سے ہونے جا رہا تھا۔ وہ آ رہا تھا۔ ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا گلدستہ لیے، چہرے پر مسکراہٹ سجائے اور انداز میں اعتماد لیے۔

آنکھوں میں محبت کے دیپ جلائے وہ قدم قدم چلتا وہاں تک آ گیا تھا جہاں اسے کئی برسوں بعد اس کی مراد ملنے والی تھی۔ اسے امید تھی۔ یا شاید اسے یقین تھا۔

"السلام علیکم!" وہ کچھ ہی فاصلے پر مؤدب سا کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام۔" اسے ایک مشترکہ جواب ملا تھا۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" وہ پھر سے نروس ہونے لگا تھا۔

لڑکی والوں نے اجازت دے دی تھی۔ یہ سب لان میں ہو رہا تھا مگر ان کی اداکاری ایسی ہی تھی جیسے وہ گھر کے دروازے پر کھڑا ہو۔

پھولوں کا گلدستہ سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر وہ درمیانی صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اوہ، معذرت! میں بنا اجازت کے ہی بیٹھ گیا۔" غلطی کا احساس ہونے پر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی اس نادانی پر سب ہنس دیے تھے۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"بیٹھ جاؤ۔" اب کی بار اجازت لبنیٰ بیگم کی طرف سے ملی تھی۔ جو اس وقت بالکل بھی اس کی ماں کے روپ میں نہیں تھیں۔

"شکریہ۔" وہ دوبارہ براجمان ہو گیا۔ اس کی نظریں امل کے چہرے سے ٹکرائی تھیں جس کے تاثرات دیکھ کر وہ اس وقت کوئی اندازہ نہیں لگا پایا تھا۔

"آپ کو میرے یہاں آنے کی اطلاع تو مل ہی چکی ہو گی اور یہ بھی کہ میں کس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں......" اس نے اپنی بات کا آغاز اپنے آنے کے مقصد سے کیا تھا۔ "میرا نام جہاں داد ہے اور میں سول ایوی ایشن اتھارٹی میں ایک بہترین عہدے پر فائز ہوں۔ مجھے آرٹ اور لٹریچر میں بہت دلچسپی ہے۔ گھر کے تمام کاموں کے لیے میں آل ان ون ہوں۔ کوکنگ میں کوئی بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جھاڑو پوچا، برتن اور کپڑے دھونا سب کر لیتا ہوں۔ اور"...... اس کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ بنا سوچے سمجھے بولے جا رہا تھا۔

اس کی باتوں سے باقی سب کی طرح حیران ہوتے ہوئے لبنیٰ بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تھا۔

"ایک منٹ بیٹا...... آپ یہاں رشتہ لینے آئے ہو یا پھر ہاؤس کیپنگ کی جاب کے لیے انٹرویو دینے۔"

ان کے یوں کہنے پر وہ جھینپ سا گیا تھا اور آنکھیں بند کر کے کچھ یاد کرنے لگا تھا۔ شاید ذہن میں نوٹس بنا رہا تھا کہ کون سی بات کرنی تھی اور کون سی نہیں۔

"پھر سے شروع کر لیتے ہیں۔" وہ خود کو ایک اور موقع دینا چاہتا تھا۔

"میرا نام جہاں داد ہے۔ میں پچھلے پندرہ سال سے آپ کی بیٹی کو پسند کرتا ہوں یا شاید شدید محبت...... اور آج کے دن کے لیے میں نے کئی سال انتظار کیا ہے تاکہ میں آپ سے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگ سکوں۔ آپ کی بیٹی میری وہ دعا ہے جو برسوں بعد قبول ہوتی ہے اور جسے بڑی تڑپ کے ساتھ مسلسل مانگا جاتا ہے۔" آنکھوں میں محبت کے دیپ جلائے وہ بس کہے جا رہا تھا۔ وہ سب کچھ جو وہ کبھی کہنا چاہتا تھا۔

"میری امی گزشتہ بارہ سالوں میں کسی اور کے ساتھ شادی کرنے پر پریشرائز کرتی رہی تھیں اور میں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ امل نے مجھے صرف ملیحہ سے شادی کرنے کی اجازت دی تھی۔ میرے لیے ملیحہ

اہل کا انتخاب تھی۔ وہ اب بھی کہیں سے آ کر کسی کو میرے لیے منتخب کر دے تو میں بنا تاخیر کے اس سے شادی کر لوں۔ میں ان سالوں میں اتنا ہی دیوانہ رہا ہوں۔ یا پھر اس سے بھی زیادہ۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ خود ہنس دیا تھا۔ "یہ سب تو اوپر کہیں آسمانوں میں لکھ دیا گیا تھا کہ ہمارا ملن ضرور ہوگا۔ لوگ تو تاعمر انتظار کی سولی پہ لٹکے رہتے ہیں اور میں نے تو فقط چودہ سال اس انتظار کو دان کیے تھے۔" اس کی آنکھوں میں اتری نمی کسی سے چھپی نہیں رہی تھی۔

لان میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آواز تھی تو ان گھنٹیوں کی جو درختوں کی شاخوں سے بندھی جھول رہی تھیں یا پھر اس شخص کی جو مراد پانے کے لیے اپنی جھولی ایک بار پھر سے اہل کے آگے بچھائے بیٹھا تھا۔ باقی سب سن رہے تھے اور اہل کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کا محبوب ہونا سب سے بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے۔ اس بات کی سچائی وہ سب دیکھ رہے تھے۔

"جوابا مجھے ہمیشہ یہی کہا جاتا رہا کہ وہ مر چکی ہے اس لیے میں اسے بھول جاؤں۔ بھلا کوئی سانس لینا بھی بھول سکتا ہے؟ دنیا والوں کے لیے وہ مر چکی تھی حتیٰ کہ میں بھی اس کی قبر پر فاتحہ پڑھ آیا تھا لیکن وہ میرے دل میں ہمیشہ زندہ رہی ہے اور میں اب اس کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ مجھے تھما دیجیے۔ میں اس کی زندگی کی ساری محرومیاں خوشیوں سے بدل دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے بھی اور آپ کی بیٹی سے بھی۔" وہ اپنی بات کہہ چکا تھا اور اب اس جواب کے لیے منتظر تھا جس کا اسے شدت سے انتظار تھا۔

سب کی آنکھیں پرنم ہو چکی تھیں۔ اہل اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں بار بار اپنی آنکھیں رگڑ رہی تھی۔

لبنیٰ بیگم نے آنکھ میں در آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے اس سے اس کا جواب پوچھا تھا۔

"کہو بیٹی! کیا تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟"

اہل نے اب کی بار آنکھوں کو زور سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے ان کی جانب دیکھا تھا اور پھر سر "نفی" میں ہلا دیا۔

"میں اب شادی کے قابل نہیں رہی...... اگر میں انہیں اپنا اچھا کل نہیں دے سکی تو میں اپنا برا آج بھی انہیں نہیں دے سکتی۔" جہاں داد سے نظر ملائے بنا وہ اٹھی اور اپنا فیصلہ سنا کر وہاں سے چلی گئی۔

آنکھ سے ایک آنسو نکلا اور جہاں داد کے گال پر بہہ گیا تھا۔ وہ آج اس "انکار" کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

"کاش میں کسی روایتی ناول کا ہیرو ہوتا۔ تمہیں گن پوائنٹ پر اغواء کر کے تم سے نکاح کرتا اور اس کہانی کی ہیپی اینڈنگ کر دیتا۔" وہ پھر سے اپنے کمرے میں جا چھپی تھی اور جہاں داد بھی ادھر ہی آ گیا تھا۔ وہ آج اس سے "اقرار" کروا کر ہی وہاں سے جانے والا تھا۔ "مگر سچ کہوں تو گن سے مجھے خود بہت ڈر لگتا ہے۔" وہ اپنی ڈرنے کی سی اداکاری پر ہنس دیا تھا۔ "لیکن کیا لڑکی واقعی ایک ایسے انسان کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے جس نے اسے اغواء کر کے اس سے شادی کی ہو؟"

وہ سوچنے لگا اور سوچ کر اندازے لگانے لگا۔

اہل سر جھکائے صرف رونے میں مصروف تھی اس لیے وہ ہر سوال جواب خود سے ہی کر رہا تھا۔

"لڑکی کو تو ویسے ہی اس نفسیاتی جنونی کا قتل کر دینا چاہیے جو یہ گھٹیا حرکت کرتا ہے۔ پتا نہیں میں نے کون سا ناول پڑھ لیا ہے جو الٹا سیدھا سوچ رہا ہوں۔ خیر! کوئی اور طریقہ ڈھونڈ لیتا ہوں تم سے "ہاں" کروانے کا۔" وہ اس کے سر پر کھڑا سوچنے لگا۔ "نہیں آ رہا ذہن میں۔" کافی دیر سوچنے کے بعد بھی وہ ناکام رہا۔ "سنو! کیا تم واقعی مجھے قتل کر دو گی اگر میں تمہیں اغوا کر کے لے جاؤں؟" وہ جھجکتے

ہوئے پوچھ رہا تھا۔
اب کی بار اہل نے اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا کہ ایسا سوچنا بھی مت۔
"میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔" اس کی نظروں کی تنبیہ سمجھ کر وہ اپنی بات سے پلٹ گیا تھا۔
"پھر تم ہی بتا دو کہ تم سے اس شادی کے لیے "ہاں" کیسے کروائی جائے؟ "اغوا کر کے؟"
"کسی حوالے سے تمہیں بلیک میل کر کے؟" رات کو خوابوں میں ڈرا کر؟" کوئی جن بھوت بن کر؟" آخر کس طرح مانو گی تم؟" اس کے پاس سب آپشن ختم ہو گئے تھے۔
"آپ فقط ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔"
"اب تو عادت ہو گئی ہے۔" وہ ہنسا تھا۔
"آپ آخر میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے؟" وہ دبے سے انداز میں تقریباً چلائی تھی۔
"نکاح کے بعد سمجھا دینا۔" وہ فی الوقت کچھ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔
"تب کیا فائدہ؟"
"فائدہ تو اب بھی نہیں۔"
"میں آپ کے قابل نہیں۔"
"میری محبت قابلیت کے وہ پیمانے نہیں رکھتی، جو تم سوچ رہی ہو۔"
"مطلب آپ نہ ٹلنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟"
"فیصلہ تو کئی سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔"
اس نے ایک نظر جہاں داد کی طرف دیکھا تھا اور خاموشی سے لب بھینچ لیے تھے۔ وہ اس کے بالکل سامنے آ گیا تھا اور اب گھٹنوں کے بل نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ یوں کہ جیسے کوئی فقیر اپنی من چاہی مراد مانگ رہا ہو مگر بے بسی کے ساتھ...... نہایت عاجزی کے ساتھ۔

چلو اب ایسا کرتے ہیں ستارے بانٹ لیتے ہیں
ضرورت کے مطابق ہم سہارے بانٹ لیتے ہیں

وہ کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں امید کے دیے جلنے لگے تھے۔

اگر ملنا نہیں ممکن تو لہروں پر قدم رکھ کر
ابھی دریائے الفت کے کنارے بانٹ لیتے ہیں

نظریں اہل کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں اور کسی تاثر کی کھوج میں اس کے چہرے پر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

میری جھولی میں جتنے بھی وفا کے پھول ہیں
اکٹھے بیٹھ کر سارے بانٹ لیتے ہیں

اہل اقرار و انکار کے بیچ میں اٹکی اسے پلکیں جھپکے بنا دیکھ رہی تھی جیسے وہ ایک خواب ہے کہ ابھی پلکیں جھپکے گی اور خواب ٹوٹ جائے گا۔ اگر یہ واقعی ایک خواب تھا تو اب اسے تاعمر یونہی ساکت بیٹھے رہنا منظور تھا۔
اور اگر وہ ایک حقیقت تھا تو تب بھی وہ عمر بھر یونہی دیکھنے کے لیے تیار تھی۔
خاموشی کے کچھ ثانیے یونہی گزر گئے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہتے ہوئے۔ دل ہی دل سے بہت کچھ سنتے ہوئے۔ جہاں داد نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر نرمی سے رکھ دیا تھا۔ اہل کی طرف سے کوئی احتجاج نہیں ہوا تھا۔ ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ وہ ابھی بھی یونہی بیٹھی تھی۔
فیصلہ ہو گیا تھا۔
اور جواب مل گیا تھا۔
چودہ سال پہلے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بچھڑنے والے دو کردار اس کہانی میں مل گئے تھے۔
اہل جہاں داد کی تھی اور جہاں داد اہل کا۔۔۔
اگر یہی طے تھا تو پھر پہلے انکار کے بعد گزرے چودہ سالوں کا کوئی ملال نہیں کہ شامِ الم یونہی آتی ہے اور ہجر محبت سے شکست کھاتا ہے۔
کھڑکی سے آتی ننھی گھنٹیوں کی آوازیں ان کی سماعتوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔
"محبت مبارک!"
"محبت میں یہ ملن مبارک!"

☆☆

inShOt